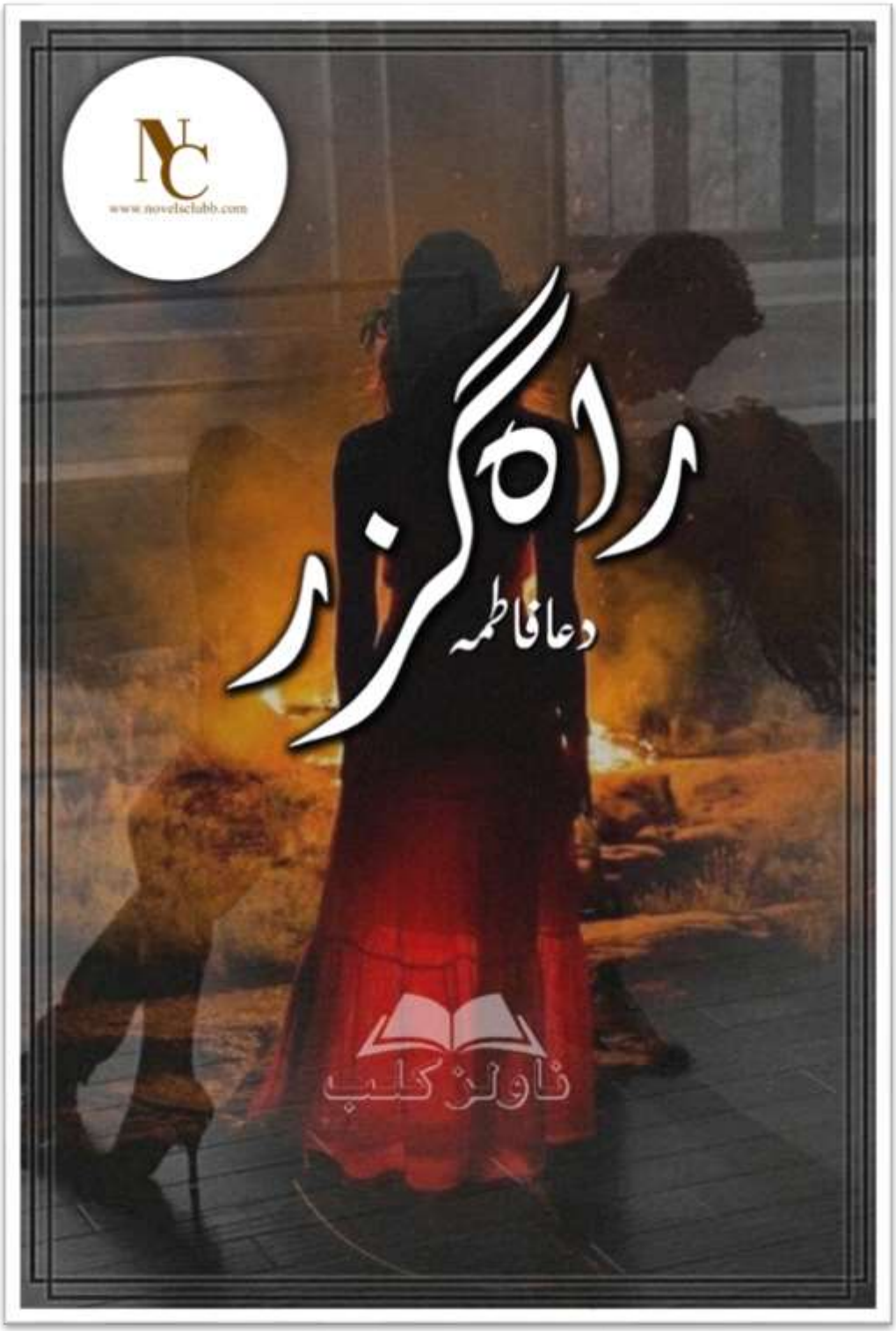
www.novelsclubb.com
راہ گزر
دعا فاطمہ
ناولز کلب

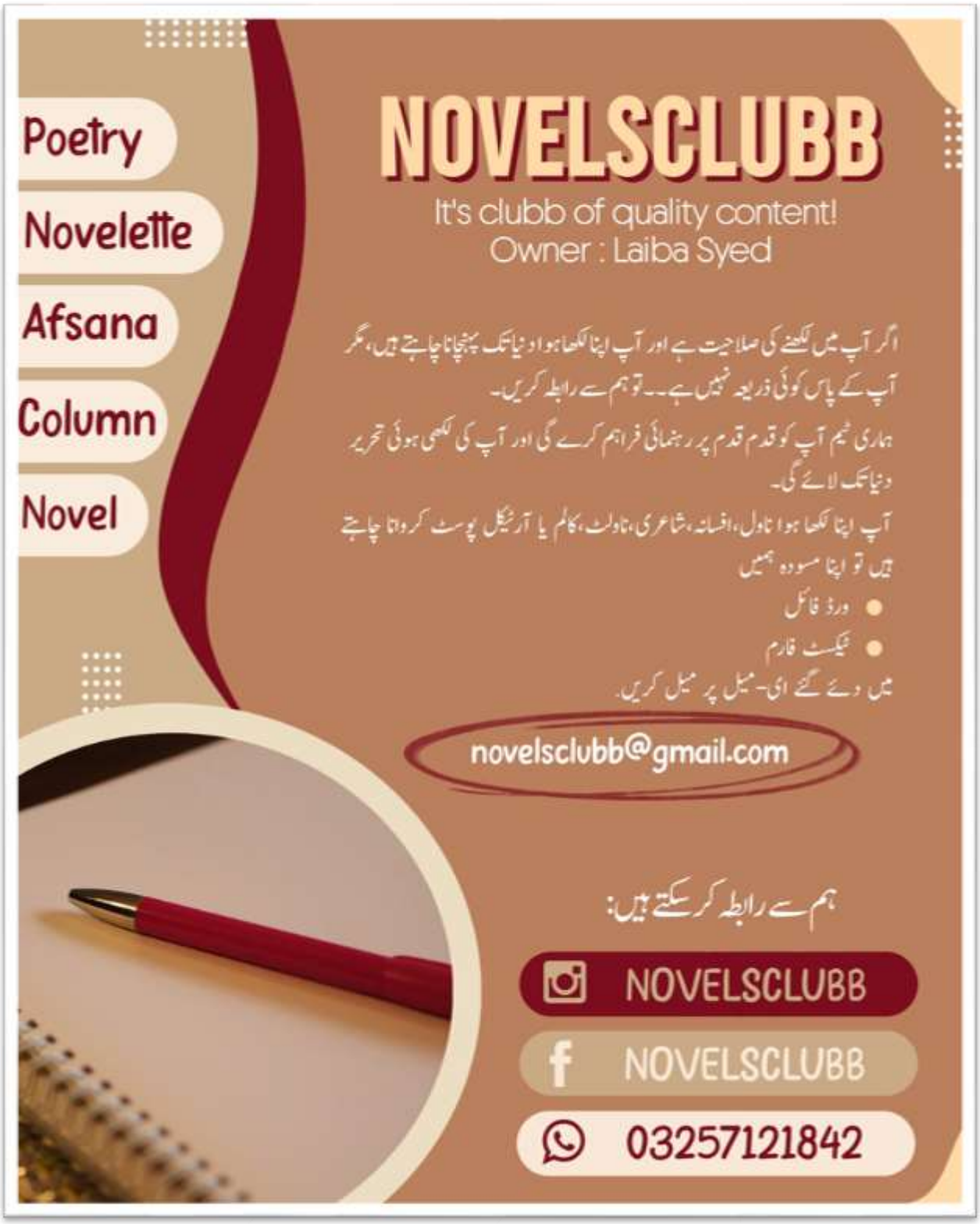
Poetry
Novelette
Afsana
Column
Novel
NOVELSCLUBB
It's clubb of quality content!
Owner : Laiba Syed
اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔ تو ہم سے رابطہ کریں۔
ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔
آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں
ورڈ فائل
ٹیکسٹ فارم
میں دیے گئے ای۔میل پر میل کریں۔
novelsclubb@gmail.com
ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں:
NOVELSCLUBB
NOVELSCLUBB
03257121842

راہ گزر

از قلم

دعا فاطمہ

www.novelsclubb.com

انتساب

میری زندگی اور اس کی تلخیوں کے نام۔۔۔زندگی کے حقیقی چہرے کے نام۔۔۔زندگی کی تلخ گہرائیوں کے نام!

www.novelsclubb.com

پیش لفظ

یہ کہانی ہے ایمان زاویار کی۔۔۔اس ایمان زاویار کی جو زندگی کے شروع ہوتے ہی اس کی تلخیوں سے جا ملتی ہے۔اس ایمان زایار کی جو زندگی گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنا ایمان کھو بیٹھتی ہے۔اس ایمان زاویار کی جس کی زندگی کی تلخیاں ہی اسے اس کا امیان واپس لوٹاتی ہیں۔اس ایمان زاویار کی جو صرف اپنے آپ کے ساتھ اس دنیا میں اکیلی رہ جاتی ہے۔

کہانی ہے زندگی کی۔اس زندگی کی جو اپنا خوبصورت نقاب اتار پھینکتی ہے۔اس زندگی کی جس کی بدصورت حقیقت سامنے آتی ہے۔اس زندگی کی جو انسان کو چاروں اور سے گھیرے اس کو تنہا کر ڈالتی ہے۔

کہانی ہے راتوں کو رونے والوں کی، کہانی ہے سسکنے والوں کی، کہانی ہے اکیلے رہ جانے والوں کی۔۔۔

www.novelsclubb.com

کہانی ہے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرّانے والے رمیص جہانزیب کی۔۔۔

کہانی ہے دور پردیس میں کہیں کھو جانے والے ارتضی مراد کی۔۔۔

داستان ہے غزل ارشد کی۔۔۔داستان ہے ایمان زاویار کی۔۔۔

اس کہانی کی سب سے ڈیزرونگ لکھاری میری نانی ہیں جنہوں نے میری تھیم سن کر ایک ہی بار میں مجھے میری کہانی کا نام بتا کر مجھے میری ناول کا پلاٹ، کلائمیکس اور اختتام تھما دیا۔ میری کہانی کو ایک نیا رخ بخشا۔ارشد شریف شہید کی سوانح عمری کچھ الگ لفظوں میں بیان کر کے میں نے ایک اور تھیم کو اس ناول کا حصّہ بنایا ہے۔سب سے آخر میں میری پوری کوشش ہے کہ میں اپنے ذہن میں قائم ہوئے اسباق کو باآسانی اس ناول کے ذریعے آپ تک پہنچا سکوں۔

والسلام

دعا فاطمہ

راہ گزر

باب 1:

معصوم محبت کا بس اتنا سا فسانہ ہے

کاغذ کی کشتی اور بارش کا زمانہ ہے

آسمان پہ سرمئی سے بادل پھیلے، سورج کو زمین پہ اپنی روشنی اور گرمی بکھیرنے سے روکے ہوئے تھے۔ ٹھنڈ سی تھی، البتہ ہواؤں کا زور نہیں چل رہا تھا۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ بارش کے امکانات صاف تھے۔ کسی بھی سمے بارش زور و شور سے شروع ہو سکتی تھی۔

فضا میں بارش والی گیلی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی۔ صبح صادق طلوع ہوئے کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ یوں اتنے سارے بادلوں نے آسمان کو گھیر لیا۔ ایسے میں حیدر آباد کے ایک

www.novelsclubb.com

پسماندہ سے علاقے کی ایک تنگ سی گلی میں بنے گھر میں جھانکا جاتا تو کچے صحن سے منسلک چھت کو جاتی سیڑھیوں سے ایک لڑکی اوپر کی اور بھاگی ہوئی جا رہی تھی۔

گندمی رنگت کی حامل، درمیانے قد کی وہ لڑکی واجبی نقوش کی حامل تھی۔ عمر تقریباً سترہ اٹھارہ سال لگتی تھی۔ بڑی سیاہ آنکھیں، سیاہ لمبے بال جو کہ مضبوطی سے چوٹی میں بندھے ہوئے تھے۔ سادہ گلابی رنگ کے پھولوں کے پرنٹ والے شلوار قمیض پہنے، گلے میں گلابی ہم رنگ دوپٹہ ڈالے، وہ کافی پرجوش سی اوپر کی اور بھاگ رہی تھی۔ چہرہ پہ خوشی کے آثار تھے۔

کچی سیمنٹ والی سیڑھیوں کو پار کرتی وہ جونہی چھت پر پہنچی، سامنے کی جانب سے آتی کالی گھٹا کو دیکھ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ایک خوشی کی لہر اس کے وجود میں دوڑ سی گئی۔ وہ بھاگتی ہوئی جا کر چھت کی منڈیر کے پاس کھڑی ہو کر سر اور نگاہیں اٹھائے، قریب آتی کالی گھٹا کو دیکھنے لگی۔

"اللہ میاں، آج بہت تیز بارش برسانا۔"، خود سے ہی بولتی، وہ کافی پرجوش سی لگتی تھی۔

لہجہ اور انداز کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی خوشی گھلی تھی۔چہرہ پہ الوہی سی چمک تھی۔آج پورے ایک سال بعد حیدر آباد میں ایسی کالی گھٹا دیکھنے کو ملی تھی۔خوشی تو بنتی تھی۔

جبھی بادل زور کا گرجے تو ڈرنے یا ہل جانے کے بجائے وہ خوشی سے چلا اٹھی۔

"اللہ پاک!!!!"،یہ اس کی خوشی کا اظہار تھا۔وہ اپنی خوشی کا اظہار ایسے ہی کیا کرتی تھی۔

زوروں سے اللہ کو پکار کر۔خوشی سے۔گندمی رنگت کا حامل چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔وہ ایسی ہی تھی۔معصوم سی۔پیاری سی۔چھوٹی چھوٹی سی باتوں پہ یونہی خوش ہو جایا کرتی تھی۔

جبھی قریب کی مسجد کے داخلی دروازے سے اس کو ایک آدمی باہر نکلتا دکھائی دیا تو اس کی سٹی گم ہوئی۔مسجد سے فجر کی نماز پڑھ کر کافی سارے نمازی گھروں کو کب کے جا چکے تھے۔صرف کچھ ہی ہوا کرتے تھے جو نماز پڑھنے کے بعد مولوی صاحب کے پاس بیٹھ جاتے تھے۔ان سے دین کی باتیں کرتے تھے۔وہ بھی ان میں سے ہی ایک تھے۔

وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیوں کے ساتھ پڑی ایک کرسی کے برابر میں ہی زمین پہ بیٹھ گئی تھی۔

ٹانگیں سمیٹ کر، ٹانگوں کے گرد بازو حمائل کر کے، وہ الوہی چمک لیے آنکھیں کالی گھٹا پہ جمائے ہوئے تھی جواب کافی قریب آگئی تھی۔ بالکل سر پہ کھڑی معلوم ہوتی تھی۔

"اللہ پاک، جلدی برسا بھی دے بارش۔ اب تڑپ بڑھتی جا رہی ہے میری۔"، وہ آنکھیں میچ کر لبوں کو گہری مسکراہٹ میں ڈھالتی، خوشی سے آسمان کی جانب دیکھتی بول رہی تھی۔ جبھی بارش کا پہلا موٹا سا قطرہ اس کے پیر کے بالکل پاس زمین پہ گرا تو اسی پل نیچے صحن کے ساتھ منسلک گھر کا بڑا لوہے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔

اگلے ہی پل اس نے مڑ کر آدھی بنی دیوار سے جھانک کر نیچے دیکھا تو اب کے وہ کچھ بڑی عمر کے آدمی چلتے ہوئے صحن کے ساتھ بنے کچن کے بالکل برابر میں بنے ایک دروازے کی سمت بڑھے۔ دروازہ باہر کی جانب کھلا تھا اور سفید چونا لگی دیوار کے ساتھ جڑا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے تھے۔ وہ لب دانتوں تلے دبائے، مسکراہٹ ضبط کرتی، پھر سے مڑ کر آسمان کو دیکھنے لگی تھی جس پہ چھائے بادل اب آہستہ آہستہ پانی کی بوندیں نیچے گراتے جا رہے تھے۔

ابھی کچھ دیر یہیں بیٹھ کر انتظار کرنا تھا۔ جب وہ سو جائیں تو اسے اٹھ کر بارش کو بھرپور انجوائے کرنا تھا۔ بس پانچ منٹ انتظار کرنا تھا۔ پانچ منٹ کے اندر اندر ہی وہ سو جائیں گے، وہ جانتی تھی۔ جبھی بارش نے تیزی پکڑی تھی۔ تڑاتڑ برستی بوچھاڑ تلے، وہ زمین پہ بیٹھی اتھل پتھل ہوتے دل کے ساتھ بارش کو گرتے دیکھ رہی تھی۔

جوش بڑھتا جا رہا تھا، بالکل بارش کی رفتار کی طرح!

اس کے لیے وہاں بیٹھے رہنا بہت زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اٹھ کر ابھی ابھی بارش تلے، جھومتی، گھومتی اور گنگنانے لگتی۔ ہاتھ پھیلا کر، ہنستی مسکراتی، وہ پھر سے ویسے ہی بارش میں کھو جانا چاہتی تھی جیسے ہر بار کھو جایا کرتی تھی۔

جبھی کچھ ہی دیر میں نیچے سے خراٹوں کی پرزور آواز گونجتی سنائی دی تو اس کے تن بدن میں گویا بجلی سی دوڑ گئی۔ اگلے ہی لمحہ پھدک کر اٹھتی وہ آگے کی جانب بھاگی تھی۔ بازو اور ہاتھ پھیلائے، وہ سر اور چہرہ اوپر کیے، آنکھیں بند کیے، مسکراتی ہوئی بارش کی بوندوں تلے، گھومتی جا

رہی تھی۔

چکر پہ چکر کھاتی، وہ اتنے چکر کھانے کے باوجود بھی بالکل ٹھیک تھی۔ کوئی چکر وغیرہ بھی نہیں آرہے تھے۔ وہ تھی ہی اتنی ڈھیٹ! ہاں ڈھیٹ ہی تھی وہ!

جبھی خوشی کے مارے وہ کھلکھلاتی ہوئی وہ وہیں زمین پہ بیٹھتی چلی گئی تھی۔ چہرہ پہ ہاتھ پھیر کر اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکرا کر اپنے اوپر پھیلے بادلوں کو دیکھے گئی۔ سیاہ و سرمئی بادل کیا غضب ڈھاتے تھے! وہ ان بادلوں اور اس موسم کی گرویدہ تھی۔

بارش کے قطرے اس کو بھگو رہے تھے۔ وہ مکمل بھیگی ہوئی، سر اٹھا کر بارش کے گرتے قطروں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ مگر آنکھیں قطروں کے گرنے کے باعث بند ہو رہی تھیں۔ وہ مسکراتی جا رہی تھی، کھلکھلاتی جا رہی تھی۔

جبھی وہ پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور منڈیر کے پاس جا کر اس پر ہاتھ رکھے، چہرہ اٹھائے پورے ذوق و شوق سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ آس پاس کے محلے کے گھروں میں اس وقت

کوئی چھتوں پہ کھڑا نظر نہ آتا تھا۔سب لوگ ظاہر ہے سو رہے تھے۔ جبھی وہ ایکسائیٹڈ سی ادھر ادھر دیکھتی، مسکرا رہی تھی۔

پھر مڑ کر گھر کے پچھلی طرف والی منڈیر پہ ہاتھ رکھے کھڑی ہو کر کچھ اچک کر دائیں جانب والی گھروں کی قطار میں بنے ایک گھر کو دیکھنے لگی۔دو منزلہ ایک سو بیس گز پہ بنا وہ گھر بھورے رنگ کا تھا۔پرانے طرز پہ بنا۔ مگر صاف ستھرا سا۔اس کی نگاہیں کسی کو تلاش رہی تھیں۔ چھوٹی سی گرل والی بالکونی میں۔ چھت پہ۔ کھڑکیوں پہ۔

مگر شاید اس کے آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا ابھی۔

وہ کچھ اداسی سے وہاں سے ہٹ کر پھر سے چھت کے وسط میں کھڑی گول گول گھومنے لگی تھی۔ چہرہ پہ پھر سے وہی خوشی لوٹ آئی تھی۔ بارش اس کی پہلی محبت تھی۔

جبھی ایک بار پھر دماغ نے اسے کہا تھا کہ دوبارہ سے جا کر ایک بار اور چیک تو کرو۔اس نے دماغ کی بات پہ عمل کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے منڈیر پہ ہاتھ رکھ کر نیچے جھانکا تو اسے گلی میں

وہ نظر آ ہی گیا۔ سفید رنگ کے شلوار قمیض کے ساتھ سر پر سفید جالی دار ٹوپی پہنے، وہ اس کا صرف اوپری رخ ہی دیکھ پائی تھی۔ اور وہ اسے یوں اوپر سے دیکھ کر ہی ایک ہی دفعہ میں پہچان گئی تھی۔

وہ ایک لڑکے کے ساتھ ہی اپنے گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ دوسرا لڑکا بھی اس کے ساتھ ہی اندر گیا تھا۔ وہ اس دوسرے لڑکے کو بھی پہچانتی تھی۔ وہ اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ دونوں اندر داخل ہو گئے تو دروازہ پیچھے سے بند کر دیا گیا۔ وہ اب کے وہیں کھڑی پر شوق نگاہوں سے گھر کو دیکھے گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ ضرور آئے گا۔

کچھ ہی منٹوں بعد ان کی چھت پہ بنا سرخ رنگ کا لوہے کا دروازہ باہر کی جانب کھلا تھا اور اس کا چہرہ دروازے میں نظر آیا تھا۔ سفید رنگ کے شلوار قمیض کے بجائے اب کے اس نے سیاہ رنگ کی ٹی شرٹ کے ساتھ بھورا ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ وہ جوں ہی چھت پہ آیا، نگاہیں بے ساختہ ہی بھٹک کر اس تک آئی تھیں۔ وہ پورے دل سے مسکرائی تھی۔ وہ بھی جواباً مسکرا کر اس کی جانب آتا، اپنی چھت کی منڈیر پہ ہاتھ رکھ کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

شہد رنگ آنکھوں والا، دراز قد سا وہ لڑکا تقریبا اٹھارہ بیس سال تک کا لگتا تھا۔ شہد رنگ بال گیلے ہو رہے تھے۔ وہ بھی بارش کے پانی میں فورا ہی بھیگ گیا تھا۔ چہرہ پہ پانی کے موٹے موٹے قطرے گرتے ہوئے نیچے لڑھکتے جا رہے تھے۔ گندمی صاف رنگت، اٹھے ہوئے نقوش، ہلکی ہلکی شیو والا وہ لڑکا مسکرا رہا تھا۔

"کیسی ہو؟"، اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے ہلکی سی آواز میں پوچھا تو وہ محض اس کے لبوں کی جنبش سے اس کی بات سمجھتے ہوئے تھمبز اپ کا اشارہ کرتی اسے اپنی خیریت کا بتانے لگی۔ وہ مسکرا دیا تھا۔ پھر یونہی اس نے سر اٹھا کر آسمان کو ڈھکے سیاہ و سرمئی بادلوں کو دیکھا تھا۔ بارش کا موسم اس کا بھی پسندیدہ تھا۔

کافی دیر تک وہ وہیں کھڑا رہا تھا۔ بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ پوچھے۔ وہ بھی یونہی کھڑی رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتی ہوئی۔ یا پھر بارش کو دیکھتی ہوئی۔ کافی دیر بعد اس نے سر تک ہاتھ لے جا کر گویا سلام کیا تھا، پھر سر ہلکے سے ہلاتا ہوا واپس جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔ وہ گیا تو وہ بھی مسکراتی ہوئی نیچے کی جانب بڑھ گئی۔

نیچے ابا اب تک خراٹے لے رہے تھے۔سب گھر والے سو رہے تھے۔کچے صحن میں گرتی پانی کی بوندیں اب ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھیں۔مون سون کی پہلی بارش تھی۔آسمان صاف ہو چکا تھا۔اب تازہ سی بوندیں زمین پہ گر رہی تھیں۔وہ مزے سے ہاتھ پہلو میں لہراتی، مسکراتے ہوئے اندر کی جانب بڑھی تھی۔اندر ایک جانب کچن بنا تھا تو دوسری جانب ایک قطار میں تین کمرے۔چھوٹا سا لاؤنج تھا جس کے ایک طرف ایک میز پر بڑا سا ٹی وی رکھا تھا۔میز کے بالکل سامنے لکڑی کے صوفے رکھے تھے۔

ابھی تو بارش ہو رہی تھی سو لائٹ نہیں تھی۔وہ آخری والے کمرے کی جانب بڑھی تھی۔دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو نظر بے اختیار ہی سامنے بیڈ پر سوئی لڑکی پہ گئی جو کہ آنکھوں پہ ہاتھ رکھے، بے ڈھنگے سے انداز میں سو رہی تھی۔اس نے سر جھٹکا تھا اور چلتی ہوئی سوئچ بورڈ تک گئی۔سوئچ بورڈ کے ساتھ ہی ایک سفید رنگ کا اضافی سوئچ بورڈ دیوار پہ نصب تھا جس پہ دو ہی بٹن تھے۔ان میں سے داہنا بٹن دبایا تو کمرے میں موجود چھت پہ لٹکتا پنکھا چلنے لگا۔

پھر مڑ کر کمرے سے باہر نکلی اور دوسرے کمرے کا دروازہ ہلکا سا ناک کر کے کھولا تو

سامنے بیڈ پر ایک لڑکا، ایک لڑکی اور ایک چھوٹی سی دو تین سال کی بچی ان کے درمیان میں لیٹی نظر آئی۔اس نے اس کمرے کا بھی سوئچ آن کیا تو ان کا بھی پنکھا کھل کر تیزی سے چلنے لگا۔

پھر تیسرے کمرے کی باری آئی۔تینوں کمروں کے پنکھے کھولنے کے بعد وہ آکر صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔ نظر یونہی مٹکتی ہوئی سامنے سوئچ بورڈ سے لگے چار جر کے ساتھ پڑے رضیہ بیگم کے موبائل فون پر گئی تو وہ مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔اس نے اٹھ کر موبائل اٹھایا اور پھر سے صوفے پہ آ بیٹھی۔

موبائل کھول کر اس نے انسٹا گرام کھولا اور یونہی اسکرول کرنے لگی۔آگے پیچھے، اوپر نیچے، پوسٹس دیکھتی اور لائک کرتی، وہ مزے سے ایک ہاتھ کی کہنی صوفے کے ہتھے سے ٹکائے، دوسرے ہاتھ سے موبائل استعمال کر رہی تھی۔ جبھی لب دانتوں تلے دبا کر اس نے میسج کالم میں جا کر ریکوئیسٹ کارنر پر کلک کیا تو ایک نیا پیج لوڈ ہو کر نگاہوں کے سامنے آیا۔

پیج میں تین چار ریکوئیسٹ درج تھیں۔اس نے بلا جھجک سب سے نیچے والی چیٹ پہ کلک

کیا تو سامنے لکھے نام کو ایک سو چار مرتبہ پڑھ ڈالا۔ سامنے سیاہ حروف میں سمپل سا لکھا تھا۔

"ارتضی مراد"

وہ مسکرائی تھی۔ دل سے۔ اس نے صرف ایک فل اسٹاپ بھیجا تھا میسج میں۔ وہ زخمی سا مسکرائی۔ پھر اس کی چیٹ بند کر کے "ڈیلیٹ آل" پہ کلک کیا تو وہ صفحہ پوری طرح سے خالی ہو گیا۔ اب کے وہ افسوس سے مسکرائی تھی۔ ہاں! وہ عجیب بھی تھی۔

پس منظر میں بارش کی گرتی بوندوں کی مدھم سی رم جھم برستی سنائی دیتی تھی۔ برستی ہوئی بارش نہایت مدھر سا نغمہ پیدا کیے دیتی تھیں۔

www.novelsclubb.com

"کیا کر رہی ہو؟"، اچانک ہی پیچھے سے ایک نسوانی آواز ابھری تو وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔ پھر اپنے سامنے کھڑی اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا تو جیسے جان میں جان آئی۔ ایک تو اس کی بہن کی آواز بھی بالکل اس کی اماں کی جیسی تھی۔ بھاری سی۔

"کچھ نہیں۔"، اس نے شانے بے پرواہی کے سے انداز میں اچکا کر رخ موڑا تھا۔ اس کی بہن

کے ذہن میں اچانک ہی کچھ کلک ہوا تو وہ ایک ہی جست میں اس تک پہنچی اور اس کو شانے سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب کیا۔

"سنو، تم نے مجھے اسکول کے لیے کیوں نہیں اٹھایا؟"، یکدم ہی پریشانی نے آن گھیرا تھا۔اسی سے مشابہت رکھتے چہرے پہ فکر تھی۔نا سمجھی بھی!

"بارش دیکھ رہی ہو باہر؟اتنی بارش میں کیا کشتی میں بیٹھ کر جاؤ گی اسکول؟"،اس نے باہر کی جانب کھلے دروازہ کی طرف اشارہ کر کے لاپرواہی سے کہا تو اس کی بہن نے بھی بے اختیار ہی اس طرف دیکھا، پھر ایک طمانیت بھرا سانس لیا۔پھر چل کر آتے ہوئے اس کے ساتھ ہی کچھ فاصلے پر صوفے پہ بیٹھ گئی۔

www.novelsclubb.com

"چلو اچھا ہے۔بارش ہو گئی۔ورنہ تو مون سون میں بھی اتنی گرمی تھی کہ بس۔"، وہ کہتی ہوئی اسے دیکھے گئی جو مسکرا رہی تھی۔وہ اپنی بڑی بہن کی بارش سے محبت سے اچھے سے واقف تھی۔جبھی اسے مسکراتے دیکھ کر مسکرا دی۔

پھر چہرہ موڑ کر اوپر لگے پنکھے کو دیکھا تو اگلے ہی پل نگاہیں موڑ کر اسے دیکھا جواب بھی

مست سی بیٹھی تھی۔

"پنکھا کیوں نہیں چلایا؟"،وہ کہتی ہوئی اٹھ کر سوئچ بورڈ کی جانب بڑھی تھی۔سوئچ بورڈ پر ہاتھ مار کر پنکھا کھولا،پھر آ کر بیٹھ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"تین پنکھے پہلے ہی چل رہے تھے۔چوتھا بھی چلتا تو یو پی ایس کی بیٹری ڈاؤن ہو جاتی۔"،اس نے لاپرواہی سے شانے اچکا کر جواب دیا تو اس کی بہن مسکرا دی۔وہ جانتی تھی کہ اسے ہمیشہ گھر والوں کی زیادہ فکر ہوا کرتی تھی۔وہ تھی ہی ایسی۔چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خوش ہو جانے والی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پہ دکھی ہو جانے والی۔

"اچھا آپی،ذرا بات تو سنو۔۔۔پلیز مجھے ناشتہ بنا دو۔"،اس نے محبت پاش نظروں سے اسے تکتے،اس کے بازو کو پکڑ کر لاڈ سے کہا تو اس نے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے جھٹکا تھا۔

"کیوں؟میں کیوں بناؤں ناشتہ؟کل شام میں تم نے مجھے پانی پلایا تھا جب میں نے مانگا تھا؟"،وہ بازو سینے پہ لپیٹ کر ابرو اچکا کر مزے سے پوچھنے لگی تھی۔بہن نے ناک بھوں چڑھا کر چہرہ موڑا تو وہ مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔پھر شانے ایک ادا سے اچکائے تھے۔

"کیا یاد رکھو گی تم کہ کس سختی سے پالا پڑا تھا۔ تم بھی ساری زندگی یاد رکھو گی کہ ایمان زاویار نامی تمہاری ایک بہن ہوا کرتی تھی، جو اتنے مزے کا پراٹھا بناتی تھی کہ بندہ انگلیاں کیا، پورے ہاتھ بھی چاٹ ڈالے۔"، وہ مزے سے کہتی چوٹی ایک ادا سے جھٹکتی کچن کی جانب بڑھ گئی تھی۔

پیچھے اس کی بہن نے مسکرا کر موبائل اٹھا کر اپنا انسٹا گرام اکاؤنٹ کھولا تھا۔

☆☆☆

ہلکے سرمئی رنگ کے خاصے بڑے گھر کا منظر ہے۔ بارش یہاں بھی تڑاتڑ برس رہی تھی۔ کراچی تھا اور مون سون۔ بارش میں ٹھنڈک سی محسوس ہوتی تھی۔ ایسے میں سرمئی رنگ کے گھر کے گرد بنے لان سے ہوتے ہوئے گھر کی پچھلی جانب جایا جاتا تو ایک چھوٹا سا سنہری آنکھوں اور سنہری بالوں والا بچہ بارش کے نیچے ہنستے کھیلتے نظر آتا۔ عمر تقریباً تین چار سال لگتی تھی۔

ہر کچھ دیر میں وہ تیز بارش میں خوشی سے مچل کر کھلکھلا دیتا اور پھر مسکرا کر چہرہ موڑ کر دور چھجے میں کھڑی اپنی ماں کو دیکھتا جو اس کے دیکھنے پر دھیرے سے مسکرا دیتی اور جوں ہی وہ مڑ

جاتا، وہ پھر سے گم سم سی بیٹھی رہ جاتی۔ عمر تقریباً پچیس چھبیس سال لگتی تھی۔

سفید ملائی جیسا چہرہ، ہیزل رنگ کی غزالی آنکھیں اور سیاہ لمبے بال جو پشت پہ کھول رکھے تھے۔ وہ نازک جسامت کی حامل بلا کی خوبصورت و حسین لڑکی تھی البتہ چہرہ پہ گہری ویرانی اور سناٹا رقم تھا۔ آنکھیں دکھی لگتی تھیں۔ چہرہ بے رونق لگتا تھا۔ جبھی اندرونی دروازے پہ ملازمہ آ کھڑی ہوئی اور چہرہ ذرا اوپر کو کر کے اسے پکارا۔

"غزل باجی، آپ کے پاپا جی کا فون آیا ہے۔"، ملازمہ نے کہا تو غزل نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔

"لینڈ لائن پہ؟"، اس کے پوچھنے پر ملازمہ نے سر عت سے سر ہلایا تھا۔ وہ سر ہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور دوپٹہ صحیح سے شانوں پہ پھیلاتی، بال انگلیوں سے سمیٹتی چھجے سے باہر نکل آئی۔

"بے بی، نانا جان کا فون آیا ہے۔ آپ دھیان سے کھیلنا۔ میں ابھی بات کر کے آتی

ہوں۔"،اس نے بہت ہی محبت اور نرمی سے اپنے بیٹے کو دیکھ کر کہا تو وہ ننھا سا بچہ سمجھ کر سر اثبات میں ہلانے لگا۔غزل چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، چھت والے حصّہ کے ساتھ چلتی ہوئی ہی اندرونی دروازے پہ پہنچی اور ملازمہ کو دیکھ کر نرمی سے بولی۔

"ثمرین، تم ارحم کے ساتھ ہی رہنا۔میں پاپا سے بات کر کے آتی ہوں۔"، سنجیدگی بھری نرمی سے کہتی وہ اندر کی جانب بڑھ گئی تو اس کو ایک نظر مڑ کر دیکھنے کے بعد ثمرین بڑے مزے سے اچھلتی ہوئی باہر لان میں ہی چلی آئی۔

"کیسا ہے ارحم بابا؟بی بی بھی کھیلیں آپ کے ساتھ؟"،وہ نوجوان سی ملازمہ مسکرا کر ارحم کا ہاتھ پکڑے اس کے ساتھ ہی کھیلنے لگی تھی۔

لینڈ لائن تک پہنچ کر غزل وہیں کرسی پہ بیٹھ گئی اور فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

"السلام علیکم پاپا۔"

"وعلیکم السلام۔کیسی ہے میری بیٹی؟"،اگلی جانب سے ارشد صاحب نے ہشاش بشاش

سے انداز میں کہا تھا۔ غزل مسکرائی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟"، وہ انگلیاں بالوں میں گھماتی ہوئی نرمی سے مسکرا کر بولی تھی۔

"میں بھی ٹھیک ہوں، الحمدللہ۔"، ارشد صاحب نے اگلی جانب سے افسوس بھری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں تکلیف ہوئی تھی۔

"آپ کب آ رہے ہیں؟"، کچھ دیر بات کرتے رہنے کے بعد غزل نے پوچھا تو اگلی جانب وہ ایک سیکنڈ کے لیے خاموش ہوئے تھے۔ غزل ان کی منتظر بیٹھی تھی۔

"آؤں گا، انشاءاللہ بہت جلد۔ تم سے بہت ضروری بات بھی کرنی ہے۔"، انہوں نے کہا تو غزل اذیت میں گھری مسکرا دی تھی۔ مسکراہٹ میں بھی تلخی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ان کو کیا بات کرنی ہو گی۔

"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ پھر بات ہو گی۔ خدا حافظ!"، کہہ کر اس نے ان کے خدا حافظ

بولنے کا انتظار کیا اور ان کے خدا حافظ بولتے ہی اس نے کھٹ سے فون رکھ دیا۔اذیت ختم نہیں ہوئی تھی۔تکلیف اب بھی تھی۔تکلیف اور اذیت ختم ہو بھی کیسے سکتی تھی؟

☆☆☆

گھر میں مصروف سا ماحول تھا۔بارش اب تک ہو رہی تھی سو موسم بھی ویسا ہی چھاؤں چھاؤں سا ہو رہا تھا۔لائٹ اب تک نہ آئی تھی۔سو گھر میں تو باہر سے کچھ زیادہ ہی چھاؤں تھی۔ایسے میں کچن سے ایک عمر رسیدہ خاتون کی چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"شان، جا کر بلا بھائی کو۔میں آخری بار بول رہی ہوں۔"،انہوں نے گردن موڑ کر بولا تو باہر لاؤنج کے صوفے پہ لیٹے لڑکے نے ایک اور انگڑائی لی۔پھر جمائی لیتا، منہ پہ ہاتھ رکھتا، پھر سے بازو قینچی کی سی صورت سر کے نیچے رکھے، لمبی تان کر لیٹ گیا۔گندمی صاف رنگت کا حامل، پندرہ چودہ سال کا وہ لڑکا اچھا دکھتا تھا۔شہد رنگ آنکھیں بند تھیں۔آنکھوں کے ہم رنگ بال بری طرح الجھے بکھرے سے تھے۔

جبھی کچن سے کچھ ہی فاصلے پہ بنے زینے سے وہ اترتا دکھائی دیا تھا۔وہی۔۔۔شہد رنگ آنکھوں اور بالوں والا۔نرم مسکراہٹ والا۔انہی صبح والے کپڑوں میں ملبوس۔

"ماں جی،ایک گھنٹے سے ناشتہ مانگا ہوا ہے۔"،وہ کچھ بیزاری سے کہتا ہوا سیڑھیاں اترتا ہوا کچن میں داخل ہوا تھا اور جا کر اس خاتون کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر دبایا تھا۔

"آدھے گھنٹے سے اس کمبخت سے کہہ رہی ہوں کہ جا کر بلا لائے تمہیں۔مگر سدا کا سست ہے یہ۔اچھا میرا بچہ،تم بیٹھو۔میں تمہارا پراٹھا نکالتی ہوں گرم گرم۔"،وہ پیار سے اسے کہتیں پھر سے توے کی جانب مڑیں اور توے سے پراٹھا اتار کر ہاٹ پاٹ میں ڈالا۔

"شان،اٹھ کر برش کر اور منہ دھو۔"،وہ ایک بار پھر مڑ کر چیخی تھیں۔اب کے وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔لمبے لمبے ڈگ بھرتا،وہ ہاتھ پہلو میں لہراتا باہر صوفے پر لیٹے چھوٹے بھائی تک گیا اور اگلے ہی پل پورے گھر میں شان مراد کی چیخیں گونجی تھیں۔درد سے بھری چیخیں۔

"ارتضی،اتنی بار کہا ہے کہ ایسے مت مارا کرو۔اس کی ہڈی وڈی ٹوٹ گئی نا تو تمہارے بابا جی تمہاری کوئی ہڈی توڑ دیں گے۔"،وہ جانتی تھیں کہ اس نے اسے ایک بار پھر ریڑھ کی ہڈی پہ مارا

ہے۔وہ اسے بارہا منع کر چکی تھیں مگر وہ سنتا ہی نہیں تھا۔

"ماں جی،اس کو پیار کی زبان سمجھ نہیں آتی۔کہتے ہیں نا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔یہ بھی انہی لاتوں کے بھوتوں میں سے ایک ہے۔باتوں سے نہیں مانے گا۔"، کہہ کر اب کے وہ تڑپتے ہوئے، پیٹھ سہلاتے شان کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ پیٹھ سے ہٹاتا،اب خود پیٹھ سہلانے لگا تھا۔

"میری ریڑھ کی ہڈی سے پانی آنے لگا ہے،ماں جی۔"، شان نے بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی تو زرینہ بی نے پراٹھا توے پہ تلتے ہوئے ہی دل پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہائے میرے اللہ۔ارتضی،اب کیا ہو گا؟"، وہ نم آنکھوں سے اچانک ہی تڑپتی ہوئی پکار اٹھی تھیں۔وہ واقعی پریشان ہو گئی تھیں۔پراٹھا توے پر تھا ورنہ وہ سب چھوڑ چھاڑ کر باہر بھی چلی آتیں۔

"میرے بھائی، یہ ریڑھ کی ہڈی اتنی نیچے کب سے ہو گئی تمہاری؟اور پانی نکلتے ہوئے کیسے دیکھ لیا تم نے؟"،اس نے اس کا کان کھینچتے ہوئے بولا تو شان بھی کھسیانہ سا مسکرا کر سیدھا ہو گیا۔لگا

واقعی اتنی زور کا نہیں تھا جتنا وہ چیخا تھا۔اور پتا نہیں ریڑھ کی ہڈی سے پانی کیسے نکلتا ہے؟

"اچھا اماں، میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔روحان کے ساتھ کہیں جانا ہے۔"، وہ کہتا ہوا اٹھ کر کچن کی جانب بڑھا تو زرینہ بی نے اسے مڑ کر دیکھا۔

"ٹھیک ہے چلے جانا۔مگر پہلے اپنا ناشتہ تو کر لو۔بھوکے پیٹ جاؤ گے تو دن بھی اچھا نہیں گزرے گا۔"، انہوں نے اب کے پراٹھا توے سے نکال کر ہاٹ پاٹ میں رکھتے ہوئے کہا تو وہ ان کی منطق پہ دل سے مسکرا دیا پھر چل کر ان تک آیا اور ان کی گردن میں بازو حمائل کیے۔محبت سے ان کے شانے پہ اپنا سر رکھا۔

"میری پیاری اماں۔ایسا کس کتاب میں لکھا ہے؟"، اس نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

"فورٹی رولز آف لیونگ ان مراد منزل میں۔"، باہر سے شان کی صدا بلند ہوئی تو ارتضی زور سے ہنس پڑا۔زرینہ بی نے اس کے پیٹ میں کہنی ماری تو وہ اور زور سے ہنستا ہوا ان کا گال پیار سے کھینچتا باہر چلا گیا۔پیچھے وہ کچھ بڑبڑا کر سر جھٹک گئی تھیں۔

☆☆☆

بارش سے بچنے کو اس چھوٹے سے ڈھابے پر ایک چھجہ سا بنایا گیا تھا۔ بارش کا پانی چھجے پر سے پھسلتا ہوا قطاروں کی سی صورت نیچے گرتا چلا جا رہا تھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے، مگر موسم ویسا ہی چھاؤں والا ہوا ہوا تھا۔ چھجہ کے نیچے چائے کے گھونٹ بھرتا وہ اپنے سامنے بیٹھے لڑکے سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔

شہد رنگ بال ماتھے پہ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اور اس کا ساتھی بہت منہمک لگتے تھے۔ جبھی وہ آنکھیں سکیڑے، سر اٹھا کر میز پر پڑی کسی شے کو دیکھنے لگا تھا۔ ذرا پاس جا کر دیکھا جاتا تو میز پر موبائل کھلا پڑا نظر آتا۔ اس کا ساتھی اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا تھا۔

وہ تقریباً اس ہی کی عمر کا لڑکا تھا۔ ہلکی ہلکی شیو والا۔ سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والا۔ ہلکی شیو والا چہرہ صاف رنگت کا حامل تھا۔ اس وقت سیاہ شلوار قمیض پہنے، گیلے بالوں کے ساتھ وہ اچھا دکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟"، پوچھنے پر ارتضی نے گردن اٹھا کر ایک نظر اپنے ساتھی کو دیکھا تھا، پھر ایک گہرا سانس لے کر سر پیچھے کو پھینکتا، تھکاوٹ سے سر اور شانے دبانے لگا تھا۔ اس کے ساتھی نے بھی

اسے دیکھ کر ایک طویل سانس خارج کیا تھا۔

"اتنی ٹینشن کیوں لے رہے ہو اپنے دماغ پہ؟ تمہاری یونیورسٹی شروع ہو گئی ہے۔اس پہ توجہ دو نا۔یہ ان چیزوں میں کہاں پڑ گئے ہو؟"،اس کے ساتھی نے اسے سمجھانے کی ایک اور کوشش کی تھی۔وہ واقعی ارتضی کے پچھلے دنوں چڑھے اس بھوت سے اکتا گیا تھا۔اس کی فکر بھی الگ تھی۔

"یار روحان،ایک تم ہی تو ہو جس کے پاس میں مشکل وقت میں آتا ہوں۔اب کیا تم بھی نہیں سمجھو گے مجھے؟"،اس نے بیچاری سی صورت بنا کر اسے دیکھ کر کہا تو روحان نے بیچارگی سے اس کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا۔ارتضی کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔وہ پھر سے سر جھکاتا،موبائل پہ کچھ اسکرول کرنے لگا تھا۔

انہماک سا انہماک تھا۔ساتھ ساتھ چائے کے گھونٹ لیتا،اب وہ روحان سے کچھ کہتا بھی جا رہا تھا۔روحان سر ہلاتا،کبھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتا تو کبھی کوئی مشورہ بھی دینے لگتا۔جبھی

ڈھابے میں ہی گھومتا پھرتا ایک لڑکا چلتا ہوا ان کی میز تک آیا تھا۔

"ہاں رضا بھائی، کہاں تک پہنچا تمہارا تلاش؟"، وہ پندرہ سولہ سال تک کا پختون لڑکا تھا۔ سرخ گالوں اور سرخ ناک والا۔ بھوری پٹھانی ٹوپی کے ساتھ بھورے شلوار قمیض پہنے، وہ کاندھے پہ رومال رکھے، مسکرا کر ارتضی کی کرسی کی پشت پہ ہاتھ رکھے، جھک کر ان دونوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔

"کیا یار رستم، کچھ ہو ہی نہیں پا رہا۔ کوشش میں تو لگے ہوئے ہیں۔ تم دعا کرو۔ اللہ مدد کرے ہماری۔"، ارتضی نے تھکے ہارے انداز میں سانس خارج کرتے ہوئے بولا تو رستم افسوس سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

"ویسے رضا بھائی، ایک بات کہوں؟ تم برا مت ماننا۔"، کہتا ہوا وہ آ کر تیسری کرسی گھسیٹ کر ان دونوں کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ایک نظر ان دونوں کو دیکھا جو اس کے ہی بولنے کے منتظر نظر آتے تھے۔ پھر گلا کھنکارا، اور کرسی گھسیٹ کر کچھ پیچھے کی۔ "تم یہ چکر چھوڑ دو۔ تمہارا یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا ہے۔ وہ بھی سرکاری یونیورسٹی میں۔۔۔ اسکالرشپ پہ۔ تم کیوں سب چھوڑ

www.novelsclubb.com

چھاڑ کر ان چیزوں میں پڑے ہو؟"،اس نے کہہ کر ایک نظر اٹھا کر ارتضی کو دیکھا جو بیزاری سے اسے دیکھ رہا تھا۔یوں گویا اسے اس کی اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔

"ام تو صرف سجھا رہا تھا۔آگے تمارا مرضی ہے۔"،وہ ہاتھ صلح جو انداز میں اٹھاتا،اٹھ کر ایک کھسیانی سی ہنسی ہنستا وہاں سے چلا گیا تھا۔پیچھے روحان نے ایک بار پھر اسے دیکھا تھا۔

" صحیح تو کہہ رہا ہے وہ۔"،اس نے کہا تو ارتضی نے تنک کر اسے دیکھا۔پھر شہادت والی انگلی اٹھا کر اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔کڑی نظروں سے اسے دیکھتا وہ بہت غصّہ میں لگ رہا تھا۔

"چل۔۔۔اٹھ۔"،اس نے انگلی اوپر نیچے کرتے ہوئے اشارہ کر کے کڑے انداز میں کہا تھا۔

روحان جھنیپ کر مسکرایا تھا۔"تجھے نہیں کرنی نا مدد؟ تو اٹھ اور جا یہاں سے۔اور اپنی شکل نہ دکھانا اب مجھے۔"

"ارے میرے یار۔تو برا کیوں مان رہا ہے؟ میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا۔"،وہ کہہ کر چہرے پہ آگے کو گرتی سیاہ بالوں کی لٹیں ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے بولا تھا۔پھر ہلکا سا مسکرایا بھی تھا۔

"اب بکواس کی تو میں اٹھ کر چلا جاؤں گا یہاں سے،سنا؟"،ارتضی نے گھورتے ہوئے تیز

لہجے میں کہا تو روحان زوروں سے سر اثبات میں ہلانے لگا تھا۔ وہ بڑا فرمانبردار بچہ تھا۔

☆☆☆

شام نے اپنے پر پھیلانا شروع کیے تو کراچی کے آسمان پر چھائے گہرے سرمئی سے بادل اب چھٹنے لگے تھے۔ بادل ہٹنے لگے تو نیلا چمکدار سا آسمان نگاہوں کو خیرہ کر دینے کی حد تک خوبصورت لگنے لگا۔ ایسے میں غزل رمیص کے گھر میں جھانکا جاتا تو وہ اپنے کمرے میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے ہوئے لیٹی نظر آتی۔ سیاہ سادہ سی بے داغ شلوار قمیض کے ساتھ سیاہ ہی دوپٹہ کاندھے پر ڈال رکھا تھا۔ سیاہ لمبے بال کھول کر شانے پر آگے کو ڈال رکھے تھے۔

www.novelsclubb.com

چہرے کی ویرانی اور بے رونقی یونہی برقرار تھی۔ زرد سنجیدہ سا چہرہ لیے وہ چپ سی بیٹھی تھی۔ ساتھ میں کچھ ہی فاصلے پر ارحم گہری نیند سویا ہوا تھا۔ جبھی اچانک ہی سائیڈ ٹیبل پر پڑا اس کا فون بج اٹھا تو اس نے آنکھیں کھول کر چہرہ ذرا سا موڑ کر فون کی اسکرین کو دیکھا جس پہ "عالم

صاحب" کا نمبر چمک رہا تھا۔ایک افسردگی بھرا سانس خارج کر کے وہ سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ موبائل سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر کال پک کی اور فون کان سے لگایا۔

"السلام علیکم عالم صاحب۔"،اس نے سنجیدہ اور اپنے ازلی نرم لہجے میں بات کا آغاز کیا تھا۔سر یونہی بیڈ کراؤن سے ٹکا رکھا تھا۔

"وعلیکم السلام مس غزل۔۔۔کیسی ہیں آپ؟"،انہوں نے سلام کا جواب دے کر عام سے انداز میں، مگر نرمی سے پوچھا تھا۔غزل کی آنکھیں پھر سے نم سی ہو گئی تھیں۔کیوں لوگ پوچھتے رہتے تھے کہ وہ کیسی ہے؟کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیسی ہو گی؟

سب کچھ جاننے کے باوجود کیا وجہ تھی کہ لوگ پھر سے زخم ادھیڑنے آن پہنچتے تھے؟

کیوں اتنے بے رحم ہوتے تھے یہ لوگ؟

اس نے ایک طویل سانس خارج کر کے آنکھیں موندی تھیں۔حلق درد کرنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔آپ کیسے ہیں؟"،اور ایک بار پھر اس نے وہی جھوٹ دہرا دیا تھا جو وہ ہر بار ہر کسی

کے سامنے دہراتی رہتی تھی۔دل درد سے پھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔تکلیف ایسی تھی کہ نا قابل بیان تھی۔

"میں بھی ٹھیک ہوں،اللہ کا شکر۔"،عالم صاحب نے اگلی جانب سے کچھ پل خاموش رہنے کے بعد جواب دیا تھا۔

"اور کیا اپڈیٹ ہے؟ کہاں تک کام پہنچا؟"،اب کے اس نے سارے دکھ ہمیشہ کی طرح پس پشت ڈال کر بے لچک لہجے میں پوچھا تھا۔یہ وہی پتھر تھا جو وہ ہر بار اس کے خیال پر اپنے سینے میں دھڑکتے دل پر رکھ دیا کرتی تھی۔ہاں!اسی کے خیال پہ!

"مس غزل۔۔۔"،ابھی عالم صاحب مزید کہنے ہی والے تھے کہ غزل نے ضبط اور برداشت سے آنکھیں بند کر کے کھولی تھیں۔سفید دمکتا چہرہ برداشت اور صبر سے سرخ پڑنے لگا تھا۔اذیت سی اذیت تھی جو اسے اپنے شکنجے میں لیے ہوئے تھی۔

"مسز غزل رمیص۔۔۔عالم صاحب۔"،کمال ضبط سے دانت پہ دانت جما کر اس نے

برداشت کی آخری حد کو چھوتے ہوئے انہیں باور کروایا تو وہ جیسے کچھ لمحوں کے لیے بالکل چپ سے ہو گئے۔

"میں نے اس لیے نہیں کہا کہ آپ کو تکلیف ہو گی۔"، انہوں نے اگلی جانب جیسے افسوس سے سر جھکایا تھا۔

"یہ نام مجھے تکلیف نہیں دیتا، عالم صاحب۔"، اس نے جواباً سنجیدگی سے کہا تو وہ چپ ہو کر رہ گئے۔ "بتایئے اب!"

"مسز غزل رمیص۔۔۔ آپ کا کیس ریڈی ہے۔ سب ہو چکا ہے۔ بس آپ کی عدّت ختم ہو تو آپ جب چاہیں مجھے بلا لیں۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔"، کمال تابعداری سے انہوں نے کہا تو وہ سمجھ کر سر ہلانے لگی۔ یہ الفاظ سن کر تکلیف اتنی ہی ہوئی تھی جتنی پچھلے چار مہینے سے ہوتی رہتی تھی۔ مگر اذیت کے ساتھ رہنا شاید سیکھنا ہو گا!

"میری عدّت ختم ہونے میں تو ابھی خاصا وقت باقی ہے۔۔۔ آپ ایسا کریں کہ جمعہ کو آ

جائیں۔"،اس نے سنجیدگی سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔

"بہت بہتر۔۔۔اور آپ بتایئے۔ارحم بابا کیسے ہیں؟"،اب کے عالم صاحب نے نہایت محبت سے ارحم کے بارے میں پوچھا تھا جس پر غزل کی نگاہیں بے ساختہ ہی کچھ فاصلے پر لیٹے ارحم تک گئی تھیں۔اسے دیکھتے ہی آنکھوں میں بے پناہ محبت عود آئی تھی۔

ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر دائیں ہاتھ کی کروٹ سے سویا ہوا وہ بہت معصوم سا لگ رہا تھا۔سنہری بال اور سنہری دمکتی ہوئی رنگت والا وہ بچّہ بہت پر سکون سا ہو کر سو رہا تھا۔وہی تو ایک وجہ تھا کہ جس کی وجہ سے غزل زندہ تھی۔وہی وجہ جس کے باعث وہ اب بھی سانسیں لے رہی تھی۔ وہی وجہ جس کے سبب وہ اتنی ہمّت کیے بیٹھی تھی،خود پہ ضبط اور صبر کے کڑے بند بٹھائے وہ اذیت میں بھی اگر مسکراتی تھی تو صرف اس کی وجہ سے۔۔۔اس کی وجہ سے اور اس کی ننھی بہن کی وجہ سے جس کے اس دنیا میں آنے سے قبل ہی اس کا باپ اس دنیا کو وداع کہہ کر چلا گیا تھا۔

"ٹھیک ہے وہ بھی۔سو رہا ہے ابھی۔"،اس نے ارحم کو ہنوز یونہی محبت پاش نظروں سے

دیکھتے ہوئے عالم صاحب سے کہا تھا۔

"چلیں، عالم صاحب۔ پھر آپ جمعہ کو آیئے گا۔ پھر آگے کی بات کریں گے ہم۔"، اس نے کہا تو وہ اگلی جانب سر ہلانے لگے۔

"خدا حافظ، مسز غزل۔"، انہوں نے کہا تو وہ بھی خدا حافظ کہہ کر فون بند کر گئی۔ فون رکھ کر اس نے ارحم کو دیکھا تھا، جو پر سکون نیند سوتا ہوا بالکل رمیص جیسا لگ رہا تھا۔ سنہری سلکی سے بال، سنہری رنگت، کھلا کھلا سا خوبصورت چہرہ بالکل رمیص جیسا تھا۔۔۔ خوبصورت، ہینڈسم، حسین، صوبر!

اسے دیکھتے دیکھتے ہی احساس ہوا تھا کہ ماضی کے لمحات اسے اپنے شکنجے مین لینے لگے ہیں۔ وہ بھی خود کو بے پرواہ کر کے آنکھیں موند کر بیٹھ گئی تو حال جیسے کہیں کوسوں دور چلا گیا۔ ماضی ہاوی ہونے لگا تھا۔ یادیں گھوم گھوم کر بار بار اس کے ذہن میں گردش کرنے لگی تھیں۔

(چند سال قبل۔۔۔

سفید رنگ کی پیروں تک آتی فراک کے اوپر سفید حجاب کے ساتھ سفید نقاب کیے وہ ایک آفس کی راہداری میں سیدھی سیدھی چلتی جا رہی تھی۔ہاتھ میں ایک سیاہ فائل تھامے، سینے سے لگا رکھی تھی۔سفید نقاب سے جھلکتی اس کی ہیزل رنگ کی آنکھیں بالکونی کے دیوار گیر شیشوں سے چھن کر آتی دھوپ میں عجب دیوانہ کیے دیتی تھیں۔

وہ سیدھ میں چلتی راہداری کے آخری سرے پہ بنے ریسیپشن ڈیسک پر گئی اور ڈیسک کو ہلکا سا ناک کیا۔ریسیپشنسٹ نے اگلے ہی پل چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"جی میم؟"

"انٹرویو ہے میرا۔"،اس نے اپنے ازلی نرم لہجے میں خوبصورتی سے کہا تو ریسیپشنسٹ نے دور نشستوں کی قطار کی جانب اشارہ کیا۔

"ادھر بیٹھ جائیے۔"

ریسیپشنسٹ کے کہنے پر اس نے چہرہ موڑ کر نشستوں کی قطار کو دیکھا تھا جہاں محض ایک

نشست کے علاوہ باقی ساری نشستیں پر تھیں۔اور اس قطار میں صرف سارے مرد حضرات ہی ہاتھوں میں اپنی فائلیں تھامے منتظر سے بیٹھے تھے۔وہ کچھ تذبذب کا شکار ہوئی تھی۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔یہاں لیڈیز کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟"،اس کے پوچھنے پر ریسیپشنسٹ نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا تھا،جیسے اس نے پتا نہیں کیا عجیب بات کر دی ہو۔وہ اب بھی ریسیپشنسٹ کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"دیکھئے میم،یہاں صرف یہی جگہ ہے۔آپ نے بیٹھنا ہے تو بیٹھیے،ورنہ وہاں کونے میں کھڑی ہو جایئے۔"،ریسیشنسٹ نے بہت ہی سنجیدگی سے بے لچک انداز میں جواب دیا تو وہ چپ ہو کر سر ہلاتی وہیں کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔فائل سینے سے لگائے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔ریسیپشنسٹ بھی کچھ دیر اسے عجیب نظروں سے دیکھنے کے بعد سر جھٹک کر اپنا کام کرنے لگی تھی۔

جبھی کافی فاصلے پہ بنی لفٹ کے دروازے کھلے تھے اور اس میں سے دو لوگ باہر نکلے

تھے۔ایک سیاہ پینٹ کوٹ پہنے ادھیڑ عمر سا بارعب اور شاندار سا آدمی تھا جو اپنے ساتھی سے نہایت پیشہ ورانہ انداز میں بات کرتا ہوا ان سب کی ہی طرف آ رہا تھا۔ریسیپشنسٹ بھی فوراً ہی کھڑی ہو گئی تھی۔

"گڈ مارننگ، سر۔"،اس کے گڈ مارننگ کا اس شخص نے محض سر ہلا کر جواب دیا تھا اور انہی تیز قدموں سے اندر بڑھتا چلا گیا تھا۔غزل کا سر تو جھکا ہوا ہی تھا جبھی اسے صرف یہ پتا چلا تھا کہ باس آ گئے ہیں۔البتہ اچانک ہی اسے کسی کی نظروں کی تپش اپنے چہرے پہ محسوس ہوئی تو اس نے یکدم ہی نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔

باس کے آفس روم کے بالکل باہر ایک لڑکا کھڑا، چہرہ موڑے اسے دیکھ رہا تھا۔سنہری آنکھوں اور سنہری بالوں والا وہ بلا کا ہینڈسم لڑکا اسے اچھنبے سے دیکھ رہا تھا۔سرمئی رنگ کی آفس شرٹ کے ساتھ سیاہ پینٹ پہنے، آستینیں کہنیوں تک موڑے، وہ بھرپور سنجیدگی سے سیدھا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔غزل کو اسے پہچاننے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا۔

وہ رمیص جہانزیب تھا۔۔۔پاکستان کا جانا مانا جرنلسٹ، جو کہ ابھی حالیہ دنوں میں ہی اپنے دوٹوک انداز، بحث و مباحثہ اور حق بات کرنے کی باعث ترقی اور شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا تھا۔ایک لمحہ کے لیے وہ ٹھٹھکی تھی، مگر پھر اگلے ہی لمحہ چہرہ اور نظریں جھکا گئی تھی۔

ویسے رمیص جہانزیب کا یہاں ہونا کوئی خاصی بے یقینی بات نہیں تھی۔ظاہر ہے کہ وہ جب اسی نیز چینل کے آفس میں جاب لینے آئی ہے تو اس سے سامنا ہونا بھی کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی کہ اس بات پہ یقین نہ کیا جا سکے۔رمیص کی نگاہیں اسے اب بھی خود پر ہی گڑھی محسوس ہو رہی تھیں، مگر وہ سر اور آنکھیں نہیں اٹھا رہی تھی۔اس کی عادت نہیں تھی یوں کسی مرد کو نگاہیں اٹھا کر دیکھنے کی۔

چند ہی سیکنڈز بعد اسے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو اس نے دھیرے سے اپنی آنکھیں اور گردن اٹھائی۔وہ اندر جا چکا تھا شاید تبھی اب وہاں کوئی نہ تھا۔خیر! اسے کیا؟اس نے شانے جھٹکے تھے۔

www.novelsclubb.com

چند ہی لمحوں بعد آفس روم کے برابر میں بنے کمرے سے ایک اسٹائلش سی لڑکی باس کے آفس روم میں گئی تھی۔وہ شاید ان کی سیکریٹری تھی۔وہ یونہی بند دروازے کو تھوڑی دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد سر پھر سے جھکا گئی تھی۔کچھ ہی پلوں بعد انٹرویو دینے کے لیے آنے والے لوگوں کو اندر بلانا شروع کر دیا گیا تھا۔وہ وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔سارے مرد،جو وہاں نشستوں پہ بیٹھے تھے،وہ ایک ایک کر کے اندر بلائے جاتے اور پھر وہاں سے جاتے رہتے۔وہ منتظر سی کھڑی،اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھتیں،وقت کے گزرنے کا احساس دلا رہی تھیں۔

جبھی آخری آدمی بھی چلا گیا تو سیکریٹری آفس روم سے نکل کر باہر آئی اور قدم قدم چلتی سیدھا اس کی جانب بڑھی۔غزل سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"مس غزل ارشد۔آپ کو باس بلا رہے ہیں۔"،سیکریٹری اس تک پہنچتی،نہایت پیشہ ورانہ انداز میں کہتی ہیلز سے ٹک ٹک کرتی اپنے آفس روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔پیچھے وہ ایک گہرا سانس لیتی سیدھی ہوئی اور قدم باس کے روم کی جانب بڑھائے۔

آفس روم کا منظر کچھ یوں تھا کہ کمرے کے وسط میں ایک بڑی میز کے سامنے پاور چیئر پر رؤف انصاری بیٹھے تھے۔ روالونگ چیئر سے ٹیک لگا کر بیٹھے وہ سامنے کرسی پر بیٹھے رمیص سے کچھ کہہ رہے تھے۔ غزل ہلکا سا ناک کر کے اندر داخل ہوئی تو رمیص کی نگاہیں بے ساختہ ہی اس کی جانب پھری تھیں۔ وہ اسے یکسر نظر انداز کرتی، اجازت ملنے پر چلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی تھی۔

"ہیو آ سیٹ، مس غزل۔"،، رؤف انصاری نے اسی پیشہ ورانہ انداز میں دوسری کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ نگاہیں ایک شان سے اٹھائے، مناسب چال چلتی ان کے سامنے، دوسری کرسی پہ آ بیٹھی تھی۔ اب کے رؤف انصاری پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔

"یس مس غزل۔۔۔ اپنا تعارف کروائیں۔"، رؤف صاحب نے کہا اور کہنیاں میز پہ ٹکا کر کچھ قریب ہو بیٹھے۔

"میرا نام غزل ارشد ہے۔ میں نے سینٹ جوزف کالج، کراچی، سے انٹر کرنے کے بعد مانچسٹر

یونیورسٹی سے میڈیا سائنسز میں بیچلرز اور کیا ہے۔ابھی چند ہی دنوں پہلے واپس پاکستان آئی ہوں۔"،اپنا مختصر سا تعارف کروا کر وہ چپ ہوئی اور ایک نظر رؤف انصاری کو دیکھا۔وہ کافی متاثر نظر آرہے تھے۔وہ نقاب کے اندر سے ہی مسکرائی تھی۔

البتہ رمیص جہانزیب کی نگاہیں اسے اپنے اوپر اب بھی ویسے ہی محسوس ہو رہی تھیں، جنہیں وہ نظر انداز کیے سیدھا رؤف انصاری کو دیکھ رہی تھی۔

"سو اوکے، مس غزل۔۔۔آپ کے پاس تجربہ نہیں ہے؟"،اب کے رؤف انصاری نے اسے سیدھا دیکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا تو اس کی حالت پتلی ہوئی۔وہ جانتی تھی کہ یہ پوائنٹ ضرور آئے گا جب اس سے تجربہ کا پوچھا جائے گا۔اور وہ تو ابھی نئی نئی ہی بیچلرز کر کے لوٹی تھی۔تجربہ کہاں ہونا تھا اس کے پاس؟انہیں دیکھتے ہوئے اس نے ہولے سے گردن نفی میں ہلائی تھی۔

"نہیں۔تجربہ نہیں ہے۔"

رؤف انصاری نے سمجھ کر سر ہلایا تھا، پھر فرصت سے رمیص کی جانب مڑے تھے۔

"جی تو رمیص جہانزیب۔آپ کیا کہیں گے اس بارے میں؟ تجربہ تو ہے نہیں ان کے پاس۔"، انہوں نے رمیص سے پوچھا تو غزل کو بے ساختہ ہی چڑ سی ہوئی۔اس سے کیوں پوچھ رہے تھے وہ؟

رمیص بڑے ہی مزے سے مسکرایا تھا۔

"آئی تھنک کہ انہیں ایک موقع دینا چاہئے۔ظاہر ہے کہ یہ اتنی بڑی جگہ سے پڑھ کر آئی ہیں۔۔۔کچھ ٹائم یہاں کام کریں گی تو تجربہ بھی مل جائے گا۔جب کچھ مہینے کا تجربہ آجائے گا ان کے پاس، تو آپ ان کی تنخواہ بڑھا دینا۔تب تک ان کو کچھ کم تنخواہ پر رکھیں، کیوں؟"، رمیص نے نہایت سنجیدگی سے صوبر سے انداز میں کہہ کر ابرو اچکا کر اسے دیکھا تو وہ فوراً ہی سر ہلانے لگی۔

اچھی ترکیب تھی یہ! تجربہ بھی حاصل ہو جائے گا اور جاب بھی مل جائے گی۔اس نے بے

اختیار سوچا تھا۔اس کے فوراسے سر ہلانے پر رمیص نے بے ساختہ ہی لبوں پر ہاتھ رکھ کر اُمڈ کر آتی مسکراہٹ کو روکا تھا۔صد شکر کہ غزل نے اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔

"اوکے مس غزل۔ مسٹر رمیص کا آئیڈیا کافی اچھا ہے۔۔۔تو آپ کب سے جوائن کر رہی ہیں پھر؟"،انہوں نے دونوں ہاتھ باہم ملا کر ہلکا سا مسکرا کر پوچھا تو وہ مسرت اور جوش سے مسکرا دی۔

"جب آپ کہیں، سر۔"،اس کے خوشی سے کہنے پر رمیص نے بے ساختہ نگاہیں پھیر کر نقاب سے جھانکتی اس کی ہیزل رنگ کی آنکھوں کو دیکھا تھا جو خوشی سے دمک رہی تھیں۔اسے خوش دیکھ کر پتا نہیں کیوں بہت خوشی ہوئی تھی!)

ارحم کے ہلکے سے ہلنے پر وہ کچھ ہل کر ماضی سے باہر آئی تھی۔چہرہ پہ عجب پیاری سی مسکراہٹ تھی۔آنکھوں کی نمی میں کسی کا سایہ نظر آرہا تھا۔۔کسی سنہری آنکھوں والے کا!

کسی سنہری بالوں والے کا!

☆☆☆

شام کا سمے تھا۔ سورج تو نہ ہی صبح میں طلوع ہوتا دکھا تھا اور نہ ہی مغرب پہ غروب ہوتا دکھا۔ بادل اب تک یونہی چھائے ہوئے تھے۔ بارش وقفے وقفے سے ہو رہی تھی۔ ایسے میں ان کے گھر کے باہر گلی میں خاصا بارش کا پانی جمع ہو چکا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے کیچڑ والے اس پانی میں کودتے چیختے جا رہے تھے۔

وہ کھڑکی کے پاس رکھے صوفے پہ گھٹنوں کے بل بیٹھی، اچک کر گلی میں دیکھ رہی تھی، جبھی پیچھے سے زرار بھائی کمرے میں آئے تھے۔

"ایمان، سو دفعہ کہہ چکا ہوں کہ اس کھڑکی سے نہ چپکا کرو۔ سمجھ نہیں آتی تمہیں میری بات؟"، وہ کڑک دار آواز میں بولے تو وہ گھبرا کر یکدم ہی پیچھے ہو کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ سانس جیسے ایک پل کے لیے رک گئی تھی۔ پھر دوبارہ سے بحال ہوئی تھی۔ اپنے سامنے کھڑے گھڑی بند کرتے زرار بھائی کو دیکھتی وہ ایک سیکنڈ کے لیے مسکرائی تھی۔

"اچھے لگ رہے ہیں آپ۔"، اچانک ہی اس نے مسکرا کر کہا تو زرار گھڑی بند کرتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا۔ پھر چلتا ہوا اس کی جانب آیا اور ہاتھ اس کے سامنے کیا۔ گھڑی بند نہیں ہو رہی تھی اس سے۔ ایمان نے فوراً ہی ہاتھ تھام کر اس کی گھڑی بند کی اور گھڑی بند کر کے ایک نظر اٹھا کر اپنے بھائی کو دیکھا۔

اسی سے مشابہت رکھتے نقوش کا حامل وہ لڑکا تقریباً چھبیس ستائیس سال کا تھا۔ البتہ رنگت ذرا صاف تھی۔ اس وقت آفس شرٹ کے ساتھ سیاہ ٹائی باندھے، وہ سیاہ پینٹ پہنے، سیاہ بال سلیقے سے پیچھے کو جمائے کافی اچھا اور شاندار سا لگ رہا تھا۔ ایمان ہمیشہ سے ہی اس کی گرویدہ رہی تھی۔

www.novelsclubb.com

"آج کیوں جا رہے ہیں ویسے؟"، اس نے یونہی پوچھا تو زرار نے ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے اس کو دیکھا، اور پھر وہیں اس کے ساتھ ہی صوفے پہ بیٹھ گیا۔

"کیا بتاؤں یار؟ ایک تو یہ پرائیویٹ جاب کا یہی مسئلہ ہے۔ جب جی چاہتا ہے، بلا لیتے ہیں۔ اب اس موسم میں بلا لیا ہے۔ ایک ارجنٹ میٹنگ رکھ دی ہے۔"، زرار نے تفصیلی جواب دے کر

اس کو دیکھا، پھر ہاتھ سے اس کے بال بگاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔ چہرہ جھکا کر اب کے ہلکا سا مسکرا کر اس کو دیکھا۔

"شانزے کو اس کی بہن کے گھر پہ بھی چھوڑنا ہے۔ ایمن کو بھی ساتھ ہی چھوڑ دوں گا۔ پھر واپسی میں پک کرتے ہوئے آؤں گا۔"، وہ کہتا ہوا جانے لگا تو ایمان یکدم ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پھر تو آپ حریر بر گر والے کے سامنے سے بھی گزریں گے نا۔ میرے لیے واپسی میں بر گر لیتے آنا، ٹھیک ہے؟"، وہ بولی تو زرار نے ایک نظر اسے سنجیدگی سے دیکھا تھا۔ پھر ابرو اچکائی۔

"کل تو کھایا تھا بر گر!"، کچھ سختی سے اس نے کہا تو ایمان سر نفی میں ہلانے لگی۔

"وہ حریر بر گر والے کا تو نہیں تھا نا۔ لے آنا پلیز۔ میں ابھی پیسے لے کر آتی ہوں۔"، وہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی اور بھاگنے لگی تو زرار پیچھے سے بلند آواز میں بول اٹھا۔

"میں باہر جا رہا ہوں۔ وہیں لے آنا پیسے۔"، وہ کہتا ہوا بال انگلی سے ہلکے پھلکے سیٹ کرتا، چلتا ہوا باہر آ گیا تھا جہاں شانزے ایمن کو لے کر کھڑی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ تینوں ساتھ ہی باہر نکلے تھے۔ ایمان تیزی سے الماری سے والٹ نکالتی، اس میں سے سو کے چند نوٹ لیتی

باہر آئی تھی۔

☆☆☆

گلی میں زرار اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتا شانزے کو دیکھ رہا تھا جو پیسنجر سیٹ کا دروازہ کھولتی ایمن کے ساتھ ہی اندر بیٹھ رہی تھی۔ بیٹھتے ہوئے ایک بیزار نظر اسے دیکھا تھا، پھر سر جھٹکتی اندر بیٹھ گئی تھی۔ زرار گھڑی پہ وقت دیکھتا گھر کے کھلے دروازہ کو دیکھنے لگا تھا۔ وہ ایمان کا ہی انتظار کر رہا تھا۔

"زرار، چلیں بھئی۔ بارش شروع ہو گئی تو مسئلہ ہو جائے گا۔ جلدی کریں۔"، شانزے گاڑی میں بیٹھی بہت نخوت سے کہہ رہی تھی۔

"ہاں بس وہ آ جائے تو۔۔۔"، وہ بات ادھوری چھوڑتا کچھ بے صبری سے دروازے کو دیکھ رہا تھا جہاں سے وہ ابھی تک نہیں آئی تھی، جبھی ہلکی سی پھوار شروع ہوئی تو شانزے تپ کر بول اٹھی۔

www.novelsclubb.com

"چلیں زرار۔دیکھ نہیں رہے؟بارش شروع ہو گئی ہے۔"،اس نے تیز لہجے میں کہا تو زرار کچھ پلوں تک دروازے کو دیکھتا سر جھٹک کر اندر بیٹھ گیا۔گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی اور وائپرز آن کرتا بیک ویو مرر میں دیکھتا آگے بڑھتا گیا۔

وہ جوں ہی گردن دروازے سے باہر نکال کر دیکھنے لگی،اسے زرار کی گاڑی گلی کے آخر میں سے موڑ مڑتی نظر آئی۔ایک لمحے کو رک کر اس نے ہلکی سی آواز لگائی تھی۔

"بھائی۔"،گلی کا موڑ موڑتی گاڑی میں بیٹھے زرار نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا جو گھر کے دروازے پہ کھڑی کچھ کہہ رہی تھی۔

"اب واپس مت جائیے گا پلیز۔"،نخوت سے کہتی وہ شیشے کے سامنے آگئی تھی،یوں کہ ایمان اب نظر نہیں آرہی تھی۔زرار ایک لمحہ اسے دیکھنے کے بعد سر جھٹکتا گاڑی زن سے آگے بڑھا لے گیا تھا۔

"بھائی۔۔۔یار،لے ہی جاتے کم از کم پیسے۔"،وہ اداسی سے بولتی افسوس میں گھری رہ گئی تھی۔اس کے بھائی کے پاس اس کے لیے چند منٹ بھی نہیں تھے۔وہ اس کے لیے ذرا بھی

انتظار نہیں کر پایا تھا۔انشرہ کو شدید دکھ نے آن گھیرا تھا۔آنکھوں میں نمی آ ٹھہری تھی۔

برستی پھوار میں وہ کھڑی یکدم ہی وہ سارے لمحات یاد کرنے لگی تھی جب جب اس کے بھائی نے اسے اس کی بھابھی کی وجہ سے نظر انداز کیا تھا۔وہ ایسی ہی تھی۔نہایت جذباتی اور دل میں باتیں رکھنے والی!

ابھی وہ پیچھے ہو کر دروازہ بند کرنے ہی لگی تھی کہ دائیں جانب سے دو لوگوں کو اپنی جانب آتے دیکھ کر وہ ٹھٹھکی تھی۔اپنے بھائی کے ساتھ چلتا ہوا وہ انہی کے گھر کی جانب آ رہا تھا۔سیاہ ہالف آستین والی ٹی شرٹ کے ساتھ نیلی جینز پہنے، بالوں کو پیچھے کو کیے، وہ اپنے ازلی صوبر، شاندار سے انداز میں چلتا اسی کی جانب آ رہا تھا۔ایمان کے دل کی دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔

وہ لگ ہی اتنا اچھا رہا تھا۔اور اس کے گھر پہ کیوں آ رہا تھا؟ وہ ساکت سی بت بنی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی جو اپنے بھائی سے کچھ کہتا ہوا اسی کی جانب آ رہا تھا۔جبھی اس نے چہرہ اور نظروں کا رخ پھیر کر دروازے کی اور دیکھا تو اسے دروازے میں ایستادہ دیکھ کر وہ ایک پل کے لیے ٹھہرا

تھا۔اس کا یہ ٹھہرنا صرف ایمان نے ہی دیکھا تھا۔

مگر اگلے ہی پل وہ سر جھٹک کر چلتا ہوا اس کے قریب ہی چلا آیا تھا۔اس کا بھائی بھی ساتھ ہی تھا۔اس کے گھر کے دروازے کے پاس آکر وہ کھڑا ہوا تھا۔ایمان ناسمجھی سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"السلام علیکم باجی۔"، جبھی اس کے برابر میں کھڑے شان نے اسے دیکھ کر مسکرا کر دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا تو وہ اسے دیکھنے لگی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔آپ لوگ۔۔۔"،ابھی وہ کچھ بول ہی رہی تھی کہ ارتضی مراد بول پڑا تھا۔

"زاویار انکل سے ملنا ہے ہمیں۔ان کو بلا دیں پلیز۔"،وہ نہایت سنجیدگی اور گھمبیرتا سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تو ایمان نے کچھ رکنے کے بعد سمجھ کر سر ہلایا۔پھر دروازہ بند کرتی اندر دوڑی چلی آئی۔

"ابا۔۔۔ابا۔"،وہ صحن میں کھڑی چیخنے لگی تو زاویار صاحب عجلت میں کمرے سے نکلتے باہر آئے۔

"کیا ہے، لڑکی؟ پاگل ہو کیا؟ اتنا چیخ کیوں رہی ہو؟"، وہ سخت لہجے میں تنک کر بولے تو ایمان جھینپ کر مسکرا دی، پھر ان کے قریب آتے ہوئے باہر کے بند دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

"باہر مراد صاحب کے بیٹے آئے ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔"، وہ بولی تو زاویار صاحب سر ہلاتے، باہر کی جانب بڑھے تھے۔ ایمان شانے بے نیازی سے جھٹکتی اندر لاؤنج کی جانب بڑھ گئی تھی۔ لاؤنج کے صوفے پہ ایک ادا سے براجمان ہوتی وہ، بازو سر کے نیچے رکھے، بڑے مزے سے صوفے پہ لیٹ گئی تھی اور سامنے چلے ٹی وی پہ چینل بدلنے لگی تھی۔

ایک ڈرامے کا چینل لگا کر وہ مزے سے لیٹ گئی۔ ریموٹ ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ اماں اور فاطمہ بھی اندر تھیں۔ سو وہ اکیلی ہی صوفے پر دراز، ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جبھی اچانک ہی چوکھٹ پہ سے پردہ ہٹایا گیا تو وہ یکدم ہی سیدھی ہو بیٹھی۔ اس کے ابا اندر داخل ہوتے ہوتے یکدم ہی رک گئے تھے۔

اسے دیکھ کر سختی سے گویا ہوئے۔

"پاگل کی بچی۔ اندر جاؤ۔"، دبے دبے غصے سے کہتے وہ شدید غصے اور تپے ہوئے انداز میں

جھڑک رہے تھے۔ایمان دوپٹہ سنبھل کر شانوں پہ پھیلاتی، کچھ نا سمجھی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ جبھی زاویار صاحب نے پھر سے ابرو اور آنکھوں سے سختی سے اشارہ کیا اور آنکھ باہر کی جانب پھیر کر اسے گھورا تو جیسے اس کی سمجھ میں آیا۔

وہ بجلی کی سی تیزی سے دوڑتی، دوپٹے کا پلو سنبھالتی اپنے کمرے کی جانب بڑھی تھی۔

پیچھے زاویار صاحب سر جھٹک کر اندر داخل ہوئے تھے اور چوکھٹ پر سے پردہ ہٹا کر ایک جانب کھسکاتے ہوئے مسکرا کر ارتضی اور شان کو اندر خوش آمدید کرنے لگے تھے۔

ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو زاویار صاحب انہیں صوفے تک لے آئے۔

"تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو، عالی؟"، ٹی وی پہ چلتے ڈرامے کی ہیروئن بہت زیادہ روتے ہوئے اپنے شوہر کا ہاتھ تھامے گڑگڑا رہی تھی۔زاویار صاحب ہلکا سا جھینپ کر مسکراتے ہوئے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کرنے لگے تھے۔شان نے امڈ کر آتی مسکراہٹ بے

www.novelsclubb.com

اختیار ہی دبائی تھی۔ پھر کاندھے سے ارتضی کا کاندھا مس کیا تو ارتضی نے کڑی نظروں سے گھور کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"آیئے نا بیٹا، بیٹھئے۔"، وہ بہت ہی نرمی سے کہتے ہوئے صوفے کی جانب اشارہ کر کے خود بھی دوسرے صوفے پہ ہی بیٹھ گئے تو وہ دونوں بھی آ کر ان کے سامنے ہی صوفے پر تمیز سے بیٹھ گئے۔ ٹانگیں جوڑے، ہاتھ پہلو میں رکھے، وہ دونوں نہایت تمیز دار سے لگ رہے تھے۔

"جی کہیے۔"، زاویار صاحب نے اب کے ان کی جانب پوری طرح سے متوجہ ہوتے ہوئے انہیں مخاطب کیا تو وہ دونوں بھی اب سنجیدہ سے ہوئے ان کو دیکھنے لگے۔ ابھی ارتضی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ شان کی ہمیشہ قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان میں پھر سے کھجلی ہوئی تھی۔ پہلو بدل کر اس نے یونہی زاویار صاحب کو مخاطب کیا تھا۔

"انکل۔۔۔وہ۔۔۔کچھ شربت وغیرہ۔۔۔یا پھر کچھ چائے وغیرہ ہو جائے تو پھر بہت ہی

اچھا ہو جائے۔"،اس نے رک رک کر احتیاط سے ایک نگاہ ارتضی پہ بھی ڈالی تھی جس نے شان کی اس بات پہ آنکھیں ضبط سے بند کر کے کھولی تھیں۔ تیر تو شان مراد چھوڑ ہی چکا تھا،اب کیا ہی کرتا وہ بیچارہ؟

زاویار صاحب شان کی بات سن کر کچھ جھینپ کر اٹھ کھڑے ہوئے تو ارتضی نفی میں سر ہلاتا ان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا اور وہ جو آگے بڑھ کر جانے ہی والے تھے،ان کو شانے سے پکڑ کر روکا۔

"ارے نہیں،انکل۔ یہ تو بد تمیز ہی ہے بہت۔ چھوڑیں اسے۔ آپ بیٹھئے۔ بابا جی نے نہایت اہم پیغام دیا ہے آپ کے لیے۔"،اس نے اپنے ازلی نرم و صوبر لہجے میں گھمبیر سی آواز میں کہا تو زاویار صاحب مسکرا کر سر نفی میں ہلانے لگے۔ پھر ارتضی کے شانے پہ ایک تھپکی دی۔

"ارے نہیں بیٹے۔ برخوردار تو نادان ہے۔ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ لڑکے ایسے ہی ہوتے

ہیں اس اتج گروپ میں۔"، وہ کہتے ہوئے اسے نگاہوں سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے، لمبے لمبے ڈگ بھرتے اندر کمروں کی جانب بڑھ گئے تھے۔ان کے جاتے ہی ارتضی ایک قدم پیچھے ہوا تھا اور مڑ کر کھینچ کر ایک دھپ شان کی گدی پہ رسید کی تھی۔

شان نے بہت ہی مشکلوں سے اس افتاد پہ اپنی چیخ کا گلا گھونٹا تھا اور پھر خفگی سے اسے دیکھتا، صوفے پہ بیٹھ کر رخ موڑ گیا تھا۔ارتضی بھی دو انگلیوں سے پیشانی دباتے ہوئے وہیں اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔ایک تو یہ ناہجار ہر جگہ ذلیل کروانے کا ٹھیکا لیے ہوئے تھا۔

☆☆☆

"ہشش۔۔۔ایمان۔اٹھو اور تین گلاس فریش جوس بنالاؤ جلدی۔"، وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر آڑی ترچھی لیٹی، اوپر چھت کو تکنے میں مصروف تھی، جبھی زاویار صاحب دروازہ ہلکا سا کھٹکھٹاتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ایک رعب سے کہتے ہوئے وہ ابھی جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی اور انہیں یکدم ہی اسی تیزی سے مخاطب کیا۔

"ابو۔۔۔وہ۔۔۔"،اس کے کہنے پر انہوں نے چہرہ موڑ کر اپنے ازلی سنجیدہ انداز میں اسے دیکھ کر ابرو سوالیہ انداز میں اچکائی تھی۔"میں یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ جوس کیسے بناؤں؟آپ لوگ تو لاؤنج میں ہی بیٹھے ہوئے ہیں؟؟؟"،سر جھکائے،لب کاٹتی ہوئی وہ پوچھنے لگی تو زاویار صاحب نے پر سوچ انداز میں ٹھوڑی تلے دو انگلیاں رکھ کر اسے دیکھا۔پھر کچھ سوچ کر اس سے سنجیدگی سے مخاطب ہوئے۔

"سر پہ ٹھیک طرح سے دوپٹہ اوڑھ کر شانوں پہ پھیلا کر باہر نکلو اور سیدھ میں دیکھتی باورچی خانے میں جاؤ۔"،وہ آواز میں وہی کڑک اور سنجیدگی لیے دوٹوک انداز میں بول کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے وہاں سے چلے گئے تو وہ لب کاٹتی،پلنگ سے اتری۔پیروں میں جیسے تیسے کر کے جلدی سے چپلیں اڑسیں اور دوپٹہ صحیح سے خود پر پھیلاتی دھیرے سے دروازہ کھولتی باہر کی جانب بڑھ گئی۔

باہر لاؤنج میں صوفے پہ ایک طرف ارتضی اور شان بیٹھے تھے جبکہ دوسرے صوفے پہ زاویار صاحب بیٹھے اب ان کی جانب پوری طرح سے متوجہ ہو چکے تھے۔وہ قدم قدم چلتی،

نگاہیں جھکائے باورچی خانے کے اندر گئی اور فریج کھول کر اندر جھانک کر دیکھا تو اندر ایک جگ میں آم کا جوس رکھا نظر آیا۔

ایمان زاویار کی تو آنکھیں ہی چمک اٹھیں۔ چلو اچھا ہے۔ کام کیے بغیر ہی کام ہو گیا۔ فورا سے جگ باہر نکال کر سلیب پر رکھا، پھر مڑ کر برتنوں کے ریک سے تین گلاس نکالے اور ایک ٹرے میں سجائے۔ پھر جگ اٹھا کر گلاس کی جانب جھکایا۔

ابھی جوس اندر گرنے ہی والا تھا کہ زاویار صاحب کی کڑک دار آواز پہ اس کا دل اچھل کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔

"یہ وتھ آؤٹ شوگر ہے۔"، وہ بہت ضبط سے وہیں صوفے پہ بیٹھے ہوئے ہی دانت پہ دانت جما کر اسے ہی دیکھ کر بول رہے تھے۔ ایمان نے بوکھلا کر ان کو دیکھا اور پھر ان سے کچھ ہی فاصلے پر سر جھکا کر بیٹھے شان کو دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت مشکلوں سے اپنی ہنسی کا گلا گھونٹے ہوئے تھا۔

شان کے برابر میں بیٹھا ارتضی سنجیدہ گہری نظروں سے بغیر کسی تاثر کے اسے دیکھ رہا تھا۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زمین میں خود کو گاڑھ کر کہیں بہت نیچے چھپا لے۔شرمندگی ہی ایسی ٹوٹ کر برسی تھی اس پر اس لمحے کہ چہرہ خفت سے سرخ پڑنے لگا تھا۔

"جی اچھا!"،وہ سر جھکا کر تیزی سے کہتی ہوئی پلٹ گئی تھی۔پیچھے زاویار صاحب کھنکار کر ان دونوں کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

"جی تو کہیے بیٹے۔"،ان کی نرم سی آواز سن کر ایمان نے بہت سے آنسو اپنے اندر ہی اندر اتارے تھے۔ساری دنیا کے لیے نرم سے زاویار صاحب صرف ایمان زاویار کے لیے ہی اتنے سخت ہو جایا کرتے تھے۔اسے ہمیشہ ہی یہ بات دکھ دیا کرتی تھی۔خیر،ایک بار ہمیشہ کی ہی طرح آنکھوں میں در آئی نمی کو پیچھے کو دھکیل کر وہ گردن سیدھی کیے اب کے فریج میں سے آم نکال کر فریش جوس بنانے لگی تھی۔

"بابا جی نے آپ سے لندن کے ٹکٹوں کے بارے میں بات کی تھی؟"،ارتضی نے بات کا آغاز کیا تو کام کرتی ایمان کے کان کھڑے ہو گئے۔بظاہر جوس بناتی وہ کن اکھیوں سے اسے ہی

دیکھ رہی تھی، جواب زاویار صاحب کو دیکھتا، جواب کا منتظر لگتا تھا۔

"جی بیٹے۔ بات تو کی تھی انہوں نے۔ ویسے جانا کسے ہے لندن؟"، زاویار صاحب نے اسی نرمی سے اس سے پوچھا تو ارتضی نے گلا کھنکارا۔ پھر کچھ آگے کو ہو کر بیٹھا اور ہاتھ باہم جوڑ کر انہیں چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ دھیان البتہ کسی اور پہ تھا!

"جی، مجھے جانا ہے۔"، اس نے کہا تو ایمان کو محسوس ہوا کہ گویا اس کے کانوں نے دھوکا کھایا ہے۔ یکدم ہی وہ ٹھہر کر سراپا کان بنی اسے سننے لگی تھی۔ دل کی دھڑکنیں غیر معمولی طور پر تیز تھیں۔ چہرہ پر اضطراب جھلکا تھا۔

"آپ نے کیوں جانا ہے، بیٹے؟ آپ کی تو یونیورسٹی شروع ہونے والی ہے۔"، زاویار صاحب نے بھی خاصی حیرت سے پوچھا تو شان اب کے ایک شان سے ارتضی کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر مسکرایا۔

"بھائی لندن جا رہے ہیں۔ ہمارے ماموں وہیں رہتے ہیں نا۔ انہی کے پاس جا رہے ہیں۔"، شان

کے بتانے پر جہاں زاویار صاحب اوہ کر کے سمجھ کر سر ہلانے لگے تھے، وہیں ایمان کا جی چاہنے لگا تھا کہ وہیں کھڑی زور زور سے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ مطلب بے بسی اتنی محسوس ہو رہی تھی کہ دل چاہ رہا تھا کہ خود کو کہیں غائب ہی کر ڈالے۔

"ویسے خیریت ہے؟ یونہی جا رہے ہو یا پھر داخلہ وغیرہ لیا ہے کسی یونیورسٹی میں؟"، زاویار صاحب نے تفصیل جاننا چاہی تو ارتضی بمشکل دھیان "اس" پر سے ہٹاتا ان کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے دل کی حالت اس پل غیر ہو رہی ہو گی، مگر وہ کیا کرتا؟ اپنی جگہ وہ بھی تو ٹھیک ہی تھا نا!

"جی، وہ دراصل داخلہ ہو گیا ہے وہیں پر یونیورسٹی میں۔ اور ماموں کے پاس کام کر کے تجربہ حاصل کرنا چاہ رہا ہوں۔ آگے اللہ مالک ہے۔"، وہ اپنے ازلی سنجیدہ اور صوبر سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ نگاہیں تو زاویار صاحب کے چہرے پر ٹکی تھیں جبکہ دھیان اب بھی بٹ نہ پایا تھا۔

"چلو، اللہ تمہیں بہت کامیاب کرے۔۔۔ ٹکٹ میں پرسوں تک بھجوا دوں گا زرار کے

ہاتھوں یا پھر فاطمہ سے۔آپ بے فکر رہو۔"،وہ نرمی سے کہتے ہوئے مسکرائے تھے۔چہرہ پہ شفقت دکھائی دیتی تھی۔ایمان نے جوس جو سر سے نکال کر گلاسوں میں انڈیل کر ٹرے میں سیٹ کیا اور ہلکا سا مڑ کر پکارا۔

"ابا،جوس تیار ہے۔"،اس نے کہا تو زاویار صاحب ان سے معذرت کرتے اٹھ کر باورچی خانے میں گئے جہاں وہ چہرہ موڑے کھڑی تھی۔انہوں نے آگے والے سلیب سے ٹرے اٹھائی اور ایک نظر اسے دیکھا۔

"تم جاؤ اب کمرے میں۔"،ان کے کہنے کی دیر تھی کہ ایمان برق رفتاری سے وہاں سے واک آؤٹ کر گئی تھی۔وہاں رکنا تو ویسے بھی اس کے لیے محال ہی ہو گیا تھا۔کمرے میں آ کر اس نے جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھائی اور دوڑتی ہوئی آ کر پلنگ پر دھپ سے لیٹ کر منہ بستر میں چھپا لیا۔

اگلے ہی لمحہ پورے کمرے میں اس کی ہچکیاں اور سسکیاں گونجنے لگی تھیں۔اتنی دیر سے روکے ہوئے آنسو کسی تیز رواں آبشار کی مانند بہنے لگے تھے۔اس پوری دنیا میں ایک وہی تو تھا جو

اپنا اپنا سا لگا کرتا تھا، اور اب تو شاید وہ بھی نہیں تھا۔ اب ایمان زاویار اکیلی تھی، بالکل اکیلی!

☆☆☆

وہ کچن میں ثمرین کے ساتھ لگ کر جلدی جلدی کام ختم کروا رہی تھی۔ ارحم کمرے میں بیٹھا کھیلنے میں مصروف تھا۔ رات چھا چکی تھی۔ روشنی جا چکی تھی۔ ہر جانب اندھیرا ہی اندھیرا چھایا تھا۔ کچن بلب کی مدھم سی روشنی سے نیم روشن ہو رہا تھا۔

"باجی، عالم صاحب کب آئیں گے؟"، جبھی سنک میں برتن دھوتی ثمرین نے چہرہ موڑ کر اس سے پوچھا تھا۔

"جمعے کو بلایا ہے۔"، مصروف سے انداز میں جواب آیا تھا۔ ثمرین نے آخری پلیٹ دھو کر ریک میں رکھتے ہوئے مڑ کر ایک نظر اسے دیکھا تھا، جو انہی سیاہ کپڑوں میں ملبوس، ویسی ہی زرد لگ رہی تھی۔ البتہ لمبے سیاہ بالوں کا گول مول کر کے ڈھیلا سا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ ان چند ہی ماہ میں اس نے غزل کو زندگی سے مردگی کی جانب جاتے دیکھا تھا۔ یہ تمام ایّام آسان نہ تھے۔ اس نے ایک

ایک لمحہ، ایک ایک پل غزل کو اذیت سے دوچار ہوتے دیکھا تھا۔

نقصان بڑا تھا۔ وقت تو لگنا تھا خود کو سنبھالنے میں۔ مگر جس طرح سے غزل نے اپنے آپ کو سنبھالا تھا، ثمرین اس کے صبر اور برداشت کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ وہ افسردگی سے اسے دیکھتی مڑ کر صابن سے اپنے ہاتھ دھونے لگی تھی۔

"آپ پکا کیس کریں گی؟"، اچانک ہی ثمرین نے پوچھا تو سلیب صاف کرتے اس کے ہاتھ ساکت ہوئے تھے۔ آنکھوں میں ڈھیر سارا کرب اترا تھا۔ حزن ختم ہی کہاں ہوتا تھا؟ تکلیف جاتی ہی کہاں تھی؟

"ہاں!"، اس نے یک لفظی جواب دے کر پھر سے ہاتھ چلانا شروع کر دیا تھا۔ ثمرین اسے چند پل یونہی گردن موڑے دیکھتی رہی، پھر گیلے ہاتھ جھٹکتی اس کے قریب ہی چلی آئی۔

"آپ ایک بار پھر سوچ لیں، باجی۔ آپ کا بیٹا چھوٹا ہے۔ کیوں اس سب سیاست میں خود کو دھکیل رہی ہیں؟ آرام سے اپنے پاپا کے پاس مانچسٹر چلی جائیں۔"، ثمرین نے ہمدردانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا تھا۔ غزل کے ہاتھ پھر سے ساکت ہوئے تھے۔ آنکھوں کا

کرب مزید بڑھا تھا۔دل کی کرچیاں آج بھی ان آنکھوں میں نظر آتی تھیں۔ابھی تو صرف چار ماہ ہی گزرے تھے، مگر وہ جانتی تھی کہ چار ماہ تو کیا، چار صدیاں گزرنے کے بعد بھی وہ یونہی رمیص جہانزیب کی یاد میں بیٹھی رہے گی۔

"آرام؟"،اب کے وہ کافی حیرت زدہ سی ثمرین کی جانب مڑی تھی۔آنکھوں کی نمی بڑھ گئی تھی۔چہرہ تکلیف بتلاتا تھا۔"آرام تو رمیص کے ساتھ تھا، ثمرین۔اس کے بغیر کون سا آرام؟ کون سا سکون؟"، وہ ٹوٹی بکھری سی لڑکی اسے اذیت سے دیکھ رہی تھی۔ ثمرین کو بے پناہ دکھ نے آن گھیرا تھا۔

"جس سیاست نے میرے شوہر کو مجھ سے چھین لیا، میرے بچوں کو یتیم اور مجھے بیوہ کر دیا، کیا اس سیاست کو اس کے انجام تک نہ پہنچاؤں؟"، کہتے کہتے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکلتے گالوں پہ لڑھکتے چلے گئے تھے۔تکلیف اور اذیت بڑھ گئی تھی۔

"کیا باقی سب کی طرح سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے رہنے کے باوجود چپ کر کے بیٹھ جاؤں؟"

"باجی، لیکن آپ کی اور آپ کے بچوں کی زندگی کا سوال ہے۔ جو لوگ رمیص صاحب کو قبر تک پہنچا گئے، وہ آپ لوگوں کے ساتھ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"، اس نے اسے ایک بار پھر سمجھانا چاہا تھا، مگر وہ سمجھتی کیسے؟ وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"میں،۔۔۔"، اس نے اپنے سینے پہ انگلی رکھ کر تیز آواز میں کہا تھا۔"رمیص جہانزیب کی بیوی، غزل رمیص ہوں۔۔۔ میں کیسے شیطانوں سے ڈر جاؤں؟ میں کیسے چپ کر جاؤں؟ میرے بچوں کی گھٹی میں بہادری ہے، شجاعت ہے۔ میں کیسے انہیں ڈر کر چپ رہنے پر مجبور کر دوں؟" وہ بلند آواز میں ہانپتے ہوئے کہتی جا رہی تھی اور ثمرین بالکل خاموش سی کھڑی اسے ہمدردی اور دکھ سے دیکھ رہی تھی۔

"میرا بیٹا ابھی چھوٹا ہے، اسی لیے کچھ جانتا نہیں ہے۔۔۔ مگر جب وہ بڑا ہو جائے گا، تو کیا وہ میرے روبرو کھڑا ہو کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے یہ سوال نہیں کرے گا کہ میں نے کیوں اس کے باپ کے قاتلوں کو یونہی جانے دیا؟ کیوں میں نے رمیص جہانزیب کی بیوی ہونے کا فرض نہ نبھایا؟ کیوں میں ڈر کر بل میں چھپ کر بیٹھ گئی؟" وہ کس اذیت میں

www.novelsclubb.com

گھری کہہ رہی تھی، یہ صرف وہی جانتی تھی۔ سانس پھولتا جا رہا تھا۔ آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔

"مگر باجی۔۔۔"، وہ ابھی کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ غزل نے ہاتھ سختی سے اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھا تھا۔ ثمرین کو چپ لگ گئی تھی۔

"تم نے آج تو یہ بات کر دی ہے، ثمرین۔ آئندہ کے بعد مت کرنا۔ میں تمہیں ڈانٹنا نہیں چاہتی۔"، اب کے کافی ضبط سے اس نے اپنی آواز تھوڑی نیچی رکھ کر دانت پہ دانت جما کر کہا تھا اور مڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتی وہاں سے چلی گئی تھی۔ پیچھے ثمرین نے گہرا سانس لے کر اس کی پشت کو دیکھا تھا۔ پھر مڑ کر ڈائننگ ٹیبل تک گئی اور وہاں سے اپنا فون اٹھایا اور کان سے لگایا۔

"سن لیا آپ نے؟ کہہ رہی تھی نا میں آپ سے کہ وہ میری بات نہیں مانیں گی۔"، ثمرین نے ہولے سے شکست خوردہ سی آواز میں کہا تو اگلی جانب ارشد صاحب نے ایک گہرا نم سانس خارج کیا تھا۔ پھر خدا حافظ کرتے فون رکھ گئے تھے۔

☆☆☆

رات ہونے تک بادل اچھا خاصے چھٹ چکے تھے اور اجلا اجلا سا گہرا سیاہ و نیلا سا آسمان نظر آنے لگا تھا۔ کہیں کہیں تارے دمکتے ہوئے اس نگاہوں کو خیرہ کرتے منظر کو اور بھی حسن بخش رہے تھے۔ایسے میں وہ چھت پر چارپائی پہ لیٹی، بازوؤں کی قینچی سر کے نیچے رکھے،افق کو دیکھ رہی تھی۔یہ اس کی روز کی روٹین میں شامل تھا۔

روز شب کو یونہی چارپائی پہ لیٹ کر کھلے وسیع سے آسمان کو تکنا! دوپٹہ اس کے برابر میں ہی چارپائی پر پڑا تھا۔ہر جانب گہری خاموشی چھائی تھی۔اس کا دل بہت اداس تھا۔اداس ہونا بھی چاہیئے تھا!

www.novelsclubb.com

رہ رہ کر ارتضی کا وہی جملہ سماعتوں میں گونج رہا تھا۔

"جی، مجھے جانا ہے۔"

وہ جانے کی پوری تیاری کیے بیٹھا تھا اور اسے بتانا تک گوارا نہ کیا۔یہ کیسی دوستی ہوئی جس

میں دھوکے بازی بھی شامل ہو؟اس نے نم آنکھیں لیے سوچا تھا۔

ایک تو ارتضی کا جانا،اور دوسرا زرار بھائی کا ہمیشہ والا لاپرواہی اور نظر اندازی والا انداز۔۔۔اس کا دل تو صبح سے ہی دکھا ہوا تھا۔وہ سب کے سامنے دکھاتی نہیں تھی۔مگر دکھی تو وہ بھی ہوا کرتی تھی!انسان ہی تو تھی بیچاری!

جبھی سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ابھری تو وہ یکدم ہی اٹھ کر سیدھی ہو بیٹھی اور تاریکی میں ہلکی سی روشنی سے آس پاس نگاہیں گھما کر پھر آخر میں سیڑھیوں کو دیکھنے لگی۔شاید کوئی اوپر آرہا تھا۔اس نے بے اختیار ہی دوپٹہ اٹھا کر گلے میں ڈالا تھا۔اگلے ہی پل سیڑھیوں کے ساتھ بنی آدھی دیوار کے اوپر سے زرار کا چہرہ ہلکا سا نظر آیا تو وہ حیرت سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سادہ سفید شلوار قمیض پہنے،آستینیں کہنیوں تک موڑے،وہ چلتا ہوا اس تک ہی آرہا تھا۔ایک ہاتھ میں کچھ تھام رکھا تھا۔ایمان نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ مسکرا کر آکر چارپائی پہ بیٹھ گیا۔پھر ہتھیلی سے چارپائی پہ ہاتھ رکھتا اسے بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگا۔

وہ نا سمجھی سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے برابر میں ہی بیٹھ گئی تھی۔

"آئی ایم سوری، ایمان۔"، زرار کی گھمبیر آواز نے خاموشی کو چیرا تو وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی، جیسے سمجھ نہ آیا ہو کہ وہ کس بات کی معافی مانگنے آیا ہے۔

"کس لیے؟"، اس نے حیرت میں ڈوبی آواز میں کہا تو زرار چہرہ موڑے اسے دیکھنے لگا۔

"تمہاری بات سنے بغیر ہی چلا گیا نا، اسی لیے۔"، زرار کی یہ بات ایمان کے لیے خاصی غیر متوقع تھی۔ یہ پہلی بار تو نہیں تھا کہ اس نے اسے نظر انداز کیا تھا، مگر یہ شرمندگی پہلی بار ہی دیکھنے کو ملی تھی۔ اس کا حیران ہونا تو بنتا تھا۔

"اس میں سوری کرنے کی کیا بات ہے؟ میں نے لوگوں کی باتوں کا برا کبھی مانا ہی نہیں ہے جو مجھے آپ کے نظر انداز کرنے پہ دکھ ہوتا۔"، اس نے صاف گوئی سے کہا تو زرار اس لمحہ مزید شرمندہ نظر آنے لگا۔ پھر کچھ اداسی سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"تمہیں بہت برا لگتا ہو گا نا کہ میں تمہیں نظر انداز کرتا ہوں، ہے نا؟"، ایمان اس کے اس سوال پہ بھونچکا رہ گئی تھی۔ آنکھیں شاک سے پھیلائے وہ اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھی جو پتا

نہیں کیوں اتنا زیادہ شرمندہ لگ رہا تھا۔

"آپ کوئی پہلے تو نہیں جو یہ کام کرتے ہیں۔ مجھے تو سب ہی نظر انداز کرتے ہیں۔ میں کسی کے انداز کا برا نہیں مانتی۔"، اس نے شانے اچکا کر کہا تو نگاہوں کے سامنے کسی کا سنجیدہ سا چہرہ لہرایا۔ اس نے سر جھٹک کر چہرہ جھکا لیا تھا۔

"تم اب مجھے مزید شرمندہ کر رہی ہو۔"، زرار نے دکھ سے بولا تو ایمان جلدی سے سر نفی میں ہلانے لگی۔

"ارے نہیں۔ آپ شرمندہ کیوں ہو رہے ہیں؟ شرمندگی کی کیا بات ہے اس میں؟"، وہ زرار کا ہاتھ تھامتی ہوئی محبت سے بولی تو زرار نے نرمی سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"تم بہت اچھی ہو، ایمان۔"، اس نے ہولے سے مسکرا کر کہا تو اب کے ایمان تلخی سے سر جھٹک کر ہنس دی۔ پھر سر نفی میں ہلا کر اسے یوں دیکھا گویا اس نے کوئی بہت بڑا مذاق کر دیا ہو۔ اس کی آنکھوں کی تکلیف بڑھی تھی۔ دل کی تکلیف پھر بھی زیادہ ہی تھی۔

"یہ تو آپ نے جھوٹ کہا ہے، خیر۔"، اس نے ہنس کر جواب دیا تو زرار سر نفی میں ہلانے لگا۔ پھر اپنے ہاتھ میں تھاما شاپر اس کے سامنے کر کے اس کی جانب بڑھایا تو وہ نا سمجھی لیے اسے دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں سوال تھا۔

"تمہارے پیسے اس لیے نہیں لیے کہ میں بھائی ہوں تمہارا۔ تمہیں کھلا سکتا ہوں۔"، زرار نے ہلکا سا مسکرا کر کہا تو ایمان ایک بار پھر تلخ ہوئی۔

"بڑی دیر سے یاد آیا ہے آپ کو۔"، یہ اس نے محض دل میں ہی کہا اور پھر اس کو شکریہ کہتی اس کے ہاتھ سے شاپر لے کر مسکرا دی۔

زرار محبت سے اس کا چہرہ تھپتھپاتا، اٹھ کر واپس ہو لیا تھا۔ ایمان نے ایک یاسیت بھری مسکراہٹ لیے اسے دیکھ کر سر جھٹکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ خیال محبت میں نہیں رکھا جا رہا۔ یہ صرف اپنے رویے کی شرمندگی تھی جسے چھٹانے کے لیے وہ یہ ہر بے استعمال کر رہا تھا۔

☆☆☆

رات نے اپنے پنجے گاڑھے تو ہر سو گہرا اندھیرا اور تاریکی سی چھا گئی۔ حیدر آباد کے کئی علاقوں میں اس پل بھی بارش جاری و ساری ہی تھی البتہ ان کے یہاں اس وقت صرف ہلکی ہلکی بوندا باندی ہی ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ موسم ان چلتی ہواؤں کے باعث کچھ سرد سا ہو گیا تھا۔

ایسے میں زاویار احمد صاحب کے گھر میں جھانکا جاتا تو ہر جانب گہری خاموشی چھائی نظر آتی۔ سب شاید سونے جا چکے تھے۔ نیم روشنی میں گھرے گھر میں یکدم ہی دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز گونجی تو ایمان کے کمرے کا دروازہ کھلتا نظر آیا تھا۔ وہ دوپٹہ سنبھال کر سر پر لیتی باہر صحن کی جانب بڑھ رہی تھی۔

صحن تک پہنچ کر اس نے ایک فارمیلیٹی نبھانے کو سر کچھ اٹھا کر تھوڑی بلند آواز میں پوچھا تھا۔

"کون؟"

"میں ہوں۔"، باہر سے آواز آئی تو اس نے سر جھٹک کر دروازہ کھولنے کے لیے چٹخنی ہٹائی۔ ہونہہ، جیسے وہ تو جانتی ہی نہیں تھی کہ کون آیا ہو گا۔ پتا نہیں کیا فضول کے چونچلے تھے یہ کہ جاننے کے باوجود روز اس وقت پوچھو، "کون؟"

اور پھر وہ آگے سے وہی پرانا تکیہ کلام دہرائیں۔

"میں۔"

اس نے دروازہ کھولا تو لمبے چوڑے سے زاویار صاحب نے قدم اندر رکھا۔ سفید سادہ سی شلوار قمیض پہنے، ہاتھ میں ایک سیاہ بیگ تھامے وہ آفس سے واپس آئے تھے۔ جھریوں زدہ چہرے پر تھکاوٹ صاف واضح تھی۔ اندر بڑھ کر بیگ اس کی جانب بڑھایا تو اس نے فوراً سے تھام کر ان کے اندر جاتے ہی پیچھے سے دروازہ بند کیا اور ان کے پیچھے پیچھے ہی چلی آئی۔

"ابا، کھانا نکالوں آپ کے لیے؟"، اس نے کچن کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھا تو وہ تھکاوٹ سے چور انداز میں گردن نفی میں ہلانے لگے۔

"نہیں، کھالیا تھا میں نے۔ آفس میں دعوت تھی۔ تم نے کھالیا؟"، کہتے ہوئے وہ ابھی اندر جانے ہی لگے تھے کہ کسی خیال کے تحت پوچھ بیٹھے۔ ایمان کا سر خود بخود ہی نفی میں ہل گیا تھا۔ وہ روزان کے ساتھ ہی کھانا کھایا کرتی تھی۔ سب لوگ کھا کر سونے چلے جایا کرتے تھے، مگر وہ ان کا انتظار کر کے روز انہی کے ساتھ کھانا کھا کر سوتی تھی۔

یہ اس کی سرد سی زندگی میں گرماہٹ کا ایک وقت ہوا کرتا تھا۔ زاویار صاحب بھی اس وقت کے لیے اسی کے عادی تھے۔ کبھی وہ جلدی سو بھی جاتی تو خاص طور پر اسے اٹھا کر اپنے ساتھ بٹھایا کرتے تھے۔ یوں تو وہ کافی سرد مہر سے تھے، ایمان کے ساتھ ان کا رویہ بھی کافی سخت تھا، مگر اولاد سے فطری انسیت انہیں بھی تھی۔

"اوہو۔۔۔ مجھے تمہیں فون کر کے بتانا یاد ہی نہیں رہا۔ چلو تم کھالو۔ میں ذرا آرام کروں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔"، وہ تھکاوٹ سے گردن دائیں سے بائیں ڈھلکا کر ہولے سے دباتے ہوئے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ ایمان وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ ایک بار پھر۔۔۔ خالی ہاتھ!

اسے دکھ ہوا تھا۔دل کو کرب نے آن گھیرا تھا۔خیر، کیا کیا جا سکتا ہے اب؟اس نے بے دلی سے سر جھٹکا تھا اور ان کا بیگ صوفے کے سامنے پڑی میز پر رکھتی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔کھانے سے دل اب اس کا بھی اٹھ گیا تھا۔

اپنے کمرے میں جا کر بالوں کا جوڑا کھول کر ڈھیلی ڈھالی سی چوٹی باندھ کر دوپٹہ گلے میں ڈالے وہ باہر پانی پینے کی غرض سے چلی آئی تھی۔قدم قدم چلتی کچن تک آئی اور فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر سلیب پہ پڑے گلاس میں پانی انڈیلا اور وہیں زمین پہ بیٹھی پینے لگی۔

پانی پینے کے بعد گلاس وہیں سلیب پہ رکھ کر وہ اٹھ کر لائٹیں بند کرنے کی غرض سے سوئچ بورڈ تک گئی اور ابھی صرف بورڈ پہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ساتھ ہی موجود ابّاں ابا کے کمرے سے آتی آوازیں سن کر وہ بے ساختہ ہی رک سی گئی تھی۔

اندر ابا بہت ہی مدھم سی آواز میں اماں سے کچھ کہہ رہے تھے۔اس نے بے ساختہ ہی تجسس سے کان دروازے سے لگائے تھے۔

"عامر کے لیے رشتہ مانگا ہے زبیر نے۔"، وہ بولے تو رضیہ بیگم حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات لیے انہیں کچھ بے یقینی سے دیکھنے لگیں۔

"فاطمہ کا؟"، انہوں نے بے ساختہ ہی پوچھا تو زاویار صاحب کچھ ٹھہر کر انہیں دیکھتے سر نفی میں ہلانے لگے۔ پھر پلنگ سے ٹیک ہٹا کر ساتھ میں ہی لیٹیں رضیہ بیگم کو دیکھا تھا۔ پھر ایک طویل سانس خارج کر کے دھیرے سے بولے۔

"ایمان کا۔"، دروازے سے کان لگا کر کھڑی ایمان زاویار کو اپنے آس پاس دھماکے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ دل بے ساختہ ہی ڈوبتا محسوس ہونے لگا تھا۔ گلے میں گلٹی ڈوب کر ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ وہ ساکت سی نظریں اپنے پیروں پہ ٹکائے گویا پتھر کا بت سی بنی کھڑی رہ گئی تھی۔

"ایمان کا؟؟؟"، رضیہ بیگم کی حیرت میں گھری آواز سنائی دی تھی۔ وہ حیرانگی کے مارے اٹھ بیٹھی تھیں اور اب کے آنکھیں پھیلائے زاویار صاحب کو دیکھ رہی تھیں، جو ان کی بات پہ دھیرے سے مسکرائے تھے۔

"ہوں۔"،انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر انہیں دیکھا تھا۔"میں نے ہاں کر دی ہے۔"

باہر بجلی زور کی کڑکی تھی۔ہر سو تاریکی میں ایک پل کے لیے روشنی سی چھائی تھی اور اگلے ہی پل سب پھر سے تاریک ہو گیا تھا۔ایمان کو اپنی زندگی بھی یونہی تاریک ہوتی محسوس ہوئی تھی۔سانس حلق میں اٹک کر حلق کو دکھانے لگا تھا۔جسم کپکپانے لگا تھا۔آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"زاویار صاحب؟آپ نے ہاں کر دی؟"،رضیہ بیگم نے بے اختیار ہی پلنگ کو کسی سہارے کے طور پر تھاما تھا۔"ایمان سے پوچھے بغیر؟"

وہ شدید بے یقینی میں گھری پوچھ رہی تھیں۔ایسا نہیں تھا کہ انہیں ایمان کی شادی نہیں کرنی تھی،مگر پچھلی بار جب رشتے والے ایمان کو رد کر کے چلے گئے تھے،تب اس نے زاویار صاحب اور رضیہ بیگم،دونوں کو سامنے بٹھا کر ہاتھ جوڑ کر درخواست کی تھی کہ اب اسے پڑھنے دے دیا جائے۔اب اس میں مزید لوگوں کے ریجیکشنز برداشت کرنے کی ہمت باقی نہیں رہی

تھی۔تب زاویار صاحب نے اسے یقین دلایا تھا کہ اب اس کی مرضی کے بغیر اس گھر میں کوئی اس کے لیے رشتہ نہیں لائے گا۔

اور اب وہ اپنی بات سے پھر رہے تھے؟

"اچھا رشتہ ہے۔۔۔اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہوں نے بچپن سے ایمان کو دیکھ رکھا ہے۔ان کو اس کی رنگت سے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"،اور اب آخر کار انہوں نے اپنے دل کی بات کہہ ہی ڈالی تھی۔رضیہ بیگم تو رضیہ بیگم، باہر کھڑی ایمان بھی ساکت بت بنی کھڑی رہ گئی تھی۔

آج ابا نے کافی عرصہ بعد ایک بار پھر اس کی رنگت کے بارے میں یوں تحقیر سے بات کی تھی۔زاویار صاحب پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اسی وجہ کے باعث وہ سب ہی پٹھانوں ہی کی طرح سپید و سرخ رنگت کے حامل تھے۔مگر اللہ کی کرنی ایسی تھی کہ ایمان زاویار ان سب سے الگ تھلگ، گندمی رنگت کی حامل ہی پیدا ہوئی تھی۔

زاویار صاحب تو اسے اپنی اولاد ماننے پر ہی شک کرتے مگر ان کے شک کرنے کی گنجائش تب نہ رہی جب پورے خاندان میں سیاہ آنکھیں رکھنے والے صرف اور صرف زاویار صاحب پر ایمان کی آنکھیں چلی گئیں۔اور تو اور، چہرہ کی واضح مشابہت بھی کچھ بھی کہنے سے باز رکھتی تھی۔

"ایک تو انہوں نے اس کی رنگت کے باوجود اس کا رشتہ مانگا،اب کیا اس میں بھی ناشکری کرتا میں؟"،انہوں نے کڑواہٹ سے کہہ کر سر جھٹکا تھا۔رضیہ بیگم چپ سی ہو گئی تھیں۔اور باہر کھڑی ایمان سے تو گویا اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔

وہ بے جان قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھی تھی اور پیچھے سے دروازہ بند کر کے وہیں دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھتی چلی گئی تھی۔جسم سے گویا کوئی قطرہ قطرہ کر کے جان سینچتا جا رہا تھا۔

حالت ناقابل بیان ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔پسینے چھوٹ رہے تھے اور دل کی دھڑکنوں

نے رفتار تیز کرلی تھی۔وہ زمین پہ بیٹھی،ٹانگوں کے گرد بازو حائل کرتی سسک پڑی تھی۔ بمشکل اپنی سسکیوں کو دبانے کی کوشش کرتی وہ تڑپ رہی تھی۔اسے اذیت ہو رہی تھی۔ تکلیف ہو رہی تھی۔نگاہوں کے سامنے کچھ پرانے مناظر لہرانے لگے تھے۔

یہ اذیت اور یہ تکلیف کوئی پہلی بار تو نہیں ملی تھی۔ایسی کئی تکالیف زاویار احمد صاحب پچھلے کئی سالوں میں کئی بار اسے دے چکے تھے۔مگر تکلیف اب نئے سرے سے ہوئی تھی کیونکہ اس بار انہوں نے اس بات کے پیچھے اس کی ذات کو بے مول کر دیا تھا۔اس کی ذات کے پرخچے اڑا دیئے گئے تھے۔

(آٹھ سال قبل۔۔۔

نوسالہ ایمان اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی شادی میں جانے کے لیے بالکل تیار سی لگتی تھی۔سادہ جامنی رنگ کے کپڑوں پہ ہلکی پھلکی نیٹ سے ڈیزائننگ ہوئی ہوئی تھی۔سیاہ بال کھول کر شانوں پہ ڈالے،وہ خود کو آئینے میں دیکھ کر مسکرائی تھی۔

www.novelsclubb.com

جبھی باہر زاویار صاحب بلند آواز میں سب کو پکارنے لگے تو وہ بھی ایک آخری نظر اپنے سراپے پہ ڈال کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ سامنے صحن کے وسط میں ہی وہ زرار بھائی اور آدم بھائی کے ساتھ کھڑے تھے۔ سادہ سفید رنگ کے شلوار قمیض پہنے وہ سادگی میں بھی ہمیشہ کی ہی طرح رعب دار اور شان دار سے لگ رہے تھے۔ سفید رنگ ان پہ جچتا تھا۔ اب کے مقابلہ میں کافی چھوٹے لگ رہے تھے۔

برابر میں کھڑے آدم بھائی بھی ان ہی کی طرح سفید شلوار قمیض پہنے بہت ہینڈسم سے لگ رہے تھے۔ وہ اس وقت تقریباً اٹھارہ انیس سال کے خوش شکل سے نوجوان تھے۔ بلا کے ہینڈسم اور ڈیسنٹ نوجوان! زرار البتہ بارہ تیرہ سال کا تھا۔

وہ صحن میں پہنچی تو اسے دیکھ کر یکدم ہی زاویار صاحب کے ماتھے پر شکنوں کا جال بنا تھا۔ بھنویں بھینچی تھیں۔ آنکھوں میں یکدم ہی کچھ پل پہلے والی نرمی کی جگہ شدید غصّے نے لے لی تھی۔

"رضیہ!"، اگلے ہی پل وہ بہت زور سے دھاڑے تھے۔ چھوٹی سی ایمان دہل کر انہیں دیکھنے لگی

تھی۔رضیہ بیگم بھی بوکھلا کر تیزی سے کمرے سے باہر آئی تھیں۔جلدی میں ایک کان میں ایئر رنگ پہنا ہوا تھا اور دوسرے میں نہیں۔

"تم سے کہا تھا نا میں نے کہ اس کو ذرا میک اپ کر دیا کرو۔سفید کرو اس کا چہرہ۔اتنی کالی لگ رہی ہے۔"،وہ بے رحمی سے سفاک لہجہ میں منہ سے گویا زہر انڈیل رہے تھے اور ایمان ایک جانب آدم بھائی کے برابر میں کھڑی پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

رضیہ بوکھلا کر سر ہلاتی تیزی سے اس تک آئی تھیں اور اس کو شانے سے تھام کر اندر کھینچتی لے گئی تھیں۔وہ کسی بے جان مشین کی طرح کھینچتی چلی گئی تھی۔آنکھیں اب بھی ساکت سی تھیں۔ہاتھ بے دم ہو کر پہلو میں گرے ہوئے تھے۔اندر کمرے میں لا کر رضیہ بیگم نے اسے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کرسی کھینچ کر بٹھایا اور میک اپ کے بکسے میں سے فاؤنڈیشن نکال کر اسے لگانے لگیں۔وہ ساکت بت بنی بیٹھی کسی کو بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

جبھی باہر سے آدم بھائی کی دھیمی سی آواز آئی تھی۔وہ دھیرے سے سخت لہجے میں زاویار

صاحب سے کہہ رہے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے ابّا؟ بچی ہے وہ۔ اتنا غصّہ؟"

زاویار صاحب نے نخوت سے سر جھٹکا تھا۔

"بچی ہے تو کیا؟ ایک تو پتا نہیں کیوں اللہ نے بے رنگ اولاد جھولی میں ڈال دی۔ فاطمہ بھی تو ہے نا۔ کتنی خوبصورت ہے۔ اور ایک یہ ہے۔"، انہوں نے تلخی سے زہر خند لہجے میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔ آدم نے لب بھینچے تھے۔ مٹھیاں ضبط سے بند کرتا وہ ان کے ایک قدم قریب چلا آیا تھا۔

"ابّا، بس کر دیں یار۔ اتنی سختی نہ برتا کریں اس کے ساتھ۔ اتنے چھوٹے دل کی ہے ویسے بھی وہ!"، آدم نے اب کے لہجہ کچھ نرم اور آواز کچھ کم کی تھی، البتہ اس بات کے لیے ناپسندیدگی اب بھی صاف جھلکتی تھی۔ زاویار صاحب نے کچھ بھی کہنے کے بجائے محض رخ موڑ لیا تھا۔ یہ جیسے بات ختم کر دینے کا عندیہ تھا۔

اندر کمرے میں منہ پہ فاؤنڈیشن لگواتی ایمان کی آنکھ سے ایک گرم گرم آنسو ٹپک کر گال

پر بہاتو رضیہ بیگم نے دلگرفتگی سے اس کا آنسو پونچھ کر اسے خود سے لگایا تھا۔

"سارے خاندان میں سب سے پرکشش ہے میری بیٹی۔ کوئی ایک بار اسے دیکھتا ہے تو مڑ کر واپس ضرور دیکھتا ہے۔ اللہ نے اتنی خوبصورت اولاد دی ہے۔ لیکن اس انسان کو قدر ہی نہیں۔"، وہ دکھ سے کہتیں جھک کر اس کا ماتھا چوم گئی تھیں۔ ان کی اپنی آنکھیں بھی نم تھیں۔ وہ ماں تھیں، بیٹی کے لیے ان کا دل بہت جلتا تھا۔

ایمان مٹی کی مورت بنی بیٹھی رہ گئی تھی۔ دل ڈوب رہا تھا۔ آنسو اندر ہی اندر گرتے اسے تکلیف دینے لگے تھے مگر وہ بیرونی مضبوطی دکھاتی، خود کو زبردستی چپ کروانے میں لگی رہی تھی۔)

www.novelsclubb.com

ایمان نے گھٹنوں سے ٹھوڑی ہٹا کر چہرہ اٹھایا تو گرم گرم آنسو گالوں پر سے بہنے لگے۔ وہ اس سب کی عادی ہوا کرتی تھی۔۔۔ مگر ابھی چند سالوں سے، جب سے آدم سے دوری آڑے آئی تھی، تب سے وہ اسے یہ سب کہنا چھوڑ گئے تھے۔ وہ اب خاموش ہی رہا کرتے تھے۔

آج اتنے عرصے بعد انہوں نے یہ بات پھر سے کہی تھی۔تکلیف آج بھی ویسی ہی ہوئی تھی جیسی اس وقت ہوا کرتی تھی۔وہ خاموش آنسو بہاتی وہیں زمین پر بیٹھی کسی غیر مرئی نقطے کو تکنے لگی تھی۔سارے تکلیف دہ مناظر گڈ مڈ ہوتے محسوس ہوئے تھے۔حواسوں پہ تکلیف ہاوی ہونے لگی تھی۔

(ڈھائی سال قبل۔۔۔

یہ اس دن کی بات ہے جب پہلی بار اس کا رشتہ آیا تھا۔زاویار صاحب کے کوئی دوست تھے جو اپنے بیٹے کے لیے اسے دیکھنے آئے تھے۔وہ اس وقت چھوٹی ہی تھی۔ابھی صرف اس کا میٹرک ختم ہونے والا تھا۔اور زاویار صاحب نے رشتہ والوں کو بلا لیا تھا۔وہ سفید رنگ کے خوبصورت لباس میں ملبوس ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھی۔سر پہ سلیقے سے دوپٹہ جمائے وہ ابھی باہر سے بلائی جانے کی منتظر سی کمرے میں بیٹھی تھی،جب زاویار صاحب اس کے کمرے میں آئے تھے۔

اس کو بیڈ پہ منتظر سا بیٹھا دیکھ کر وہ اس کے قریب چلے آئے تھے۔اپنے ازلی رعبدار انداز میں اسے دیکھتے وہ اس سے کچھ فاصلے پر ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ہاتھ پیچھے باندھے،اسے سخت نظروں سے دیکھتے وہ اپنے سرد سے انداز میں گویا ہوئے تھے۔

"گلناز کی شادی پہ جو سیاہ شلوار قمیض بنوائے تھے،وہ پہنو۔سفید میں تمہاری رنگت دب رہی ہے۔"،انہوں نے اپنے اسی انداز میں سختی سے حکم سنایا اور اگلے ہی لمحہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے وہاں سے چلے گئے تھے۔

پیچھے وہ یونہی بت بنی بیٹھی رہ گئی تھی۔کیا آج کے دن بھی اسے یہ سب سننے کو ملنا تھا؟کیا وقعت تھی اس کی؟کیا حیثیت؟کیا کچھ بھی نہیں؟وہ افسوس میں گھری دھیرے سے اٹھتی چلی گئی تھی۔

اسی دن کی رات میں وہ سب کے ساتھ ہی صحن کے ایک کونے پہ پڑی چارپائی پہ زاویار صاحب کے سامنے بیٹھی تھی۔نظریں کسی مجرم کی طرح جھکا رکھی تھیں۔آنکھیں نم تھیں۔

پہلو میں گرے ہاتھ بھی کپکپاہٹ کا شکار تھے۔لب پھر پھرا رہے تھے۔

"بس؟ہو گئی خوش؟"،زاویار صاحب تلخ لہجے میں رضیہ بیگم سے مخاطب ہوئے تھے جو اس کے برابر میں ہی بیٹھی تھیں۔گھر میں ان تینوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔آدم تو لندن جا چکا تھا اور زرار بھی اس وقت اکیڈمی سے واپس نہیں آیا تھا۔فاطمہ اپنی نانی کے ہاں رکنے گئی ہوئی تھی۔

"اس میں خوشی والی کیا بات ہے؟"،ان کی بات پر رضیہ بیگم نے کچھ حیرت سے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے استفسار کیا تھا۔چہرہ پہ نا سمجھی کے آثار تھے۔آنکھوں میں سوال تھے۔

"خوش ہی ہو گی نا تم۔جب میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے صحیح سے میک اپ کرو تو تم نے میری سنی نہیں۔اور اب نتیجہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔"،وہ اسی سخت لہجے میں ماتھے پہ بل لیے بولے تو رضیہ بیگم نے سر نفی میں ہلایا۔

"انہوں نے کہا تھا کہ لڑکی بہت چھوٹی ہے اور ہمارا بیٹا بہت بڑا۔پندرہ سال کا فرق ہے دونوں میں۔اسی لیے منع کیا انہوں نے رشتہ سے۔"،رضیہ بیگم نے کئی بار کی دہرائی گئی بات ایک بات پھر دہرائی تو زاویار صاحب قطعیت سے سر نفی میں ہلانے لگے۔جیسے حقیقت یہ نہیں،اس

بات کا انہیں پورا یقین ہو۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔یہ تو بس بہانہ ہے۔اصل میں تو اس کی رنگت کی وجہ سے منع کیا ہے انہوں نے۔"،وہ اسی انداز میں بولے تو سر جھکائے بیٹھی ایمان نے ایک سسکی لی تھی۔آنسو بہہ چلے تھے۔

"اللہ اکبر،زاویار صاحب۔ایسا کچھ نہیں ہے۔انہوں نے تو اسے دیکھتے کے ساتھ بول دیا تھا کہ ارے آپ کی بیٹی تو ابھی بچی ہے۔ہمارا بیٹا ابھی تیس سال کا ہے۔"،رضیہ بیگم نے انہیں سمجھانے کی ایک اور کوشش کی تھی جو ان کے صرف نفی میں سر ہلانے سے ہی ضائع کر دی گئی تھی۔)

وہ زمین پہ بیٹھی،سر دروازے سے ٹکائے گھٹ گھٹ کر سسک رہی تھی۔آنسو تیز رفتاری سے گالوں پہ لڑھکتے چلے جا رہے تھے۔حلق درد کرنے لگا تھا۔آنکھیں متورم سرخ سی ہو رہی تھیں۔آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔پورا جسم کپکپاہٹ کا شکار تھا۔دماغ میں گھوم گھوم کر ایک چہرہ آ رہا تھا۔

www.novelsclubb.com

صوبر سخت سا چہرہ، پر کشش نقوش کا حامل چہرہ۔۔۔ارتضی مراد کا چہرہ۔

کیا اس کی چاہت بس اتنی ہی تھی؟ کیا دونوں کا ساتھ بس اتنا ہی تھا؟ کیا راستے اب جدا ہونے والے تھے؟

وہ وہیں زمین پہ بیٹھی پوری رات سسکتی بلکتی رہی تھی۔آواز اتنی کم تھی کہ ایک ہی کمرے میں اس کے بالکل سامنے پلنگ پہ سوئی فاطمہ بھی اس کی سسکیاں نہیں سن پائی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں جائے نماز پہ بیٹھی، ہاتھ اٹھائے کسی غیر مرئی نقطے کو تک رہی تھی۔ آنکھوں میں وہی ویرانی چھائی تھی جو چار مہینوں سے چھائی رہتی تھی۔کمرہ نیم روشن تھا۔ صرف ایک نائٹ بلب جلا ہوا تھا۔اے سی نے کمرے کو سرد کر رکھا تھا۔پیچھے پلنگ پہ ارحم گہری نیند سو رہا تھا۔

نگاہیں پھیر کر اس نے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا تھا۔کبھی ان ہاتھوں میں رمیص کے نام

www.novelsclubb.com

کی مہندی سجائی گئی تھی۔اس کا نام لکھا گیا تھا۔اس دن جب رمیص نے اسے اپنے نام کر دیا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!

اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر ہتھیلی پر گرا تھا۔اسے محسوس بھی نہیں ہوا تھا۔وہ یونہی ساکت پتھر بنی بیٹھی اب اپنی ہتھیلی کو دیکھ رہی تھی۔ تبھی اس کے لب دھیرے سے ہلے تھے۔ کمرے کی خاموش پڑی فضا میں اس کی لرزتی آواز گونجی تھی۔

"اللہ پاک۔۔۔"،وہ نم آنکھیں لیے اپنی ہتھیلی کو دیکھ رہی تھی۔"کیوں اتنی جلدی اسے بلا لیا اپنے پاس؟ہاں مانتی ہوں کہ وہ شہید ہے،زندہ ہے۔۔۔مگر مجھ سے تو دور ہے نا؟"،آواز نم ہو گئی تھی۔چہرہ آنسوؤں سے بھیگتا جا رہا تھا۔اذیت وہی تھی۔تکلیف بھی وہی تھی!

اس نے چہرہ اٹھایا تھا۔۔۔جیسے اپنے اللہ کو دیکھ کر اس سے سیدھا مخاطب ہونے کے لیے اٹھایا ہو۔

"اللہ،میں نے ساری زندگی بہت صبر کیا۔۔۔مگر۔۔۔"،وہ پھپھک کر رو دی تھی۔

کمرے میں اس کی سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ در و دیوار افسوس سے اسے دیکھ رہے تھے جو روز اس وقت اپنے خدا کے سامنے ٹوٹ اور بکھر جایا کرتی تھی۔ وہ چار مہینے سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ تکلیف ہر بار ہی ہوا کرتی تھی انہیں۔

"مگر اب مجھے صبر کرنا بہت مشکل لگ رہا ہے، میرے اللہ۔ مجھ سے صبر ہو ہی نہیں رہا۔ میرے دل کو تسلی مل ہی نہیں رہی۔ میری بے چین روح کو چین مل ہی نہیں رہا۔۔۔ میں کیا کروں، اللہ؟ میں کیا کروں؟"، وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ تکلیف جاتی ہی کہاں تھی؟

"رمیص گیا اور جاتے جاتے میری زندگی کا سکون، چین اور خوشیاں سب ساتھ لے گیا۔۔۔ میری برداشت بھی ساتھ ہی لے گیا۔۔۔ میں تیری مرضی کے آگے نہ کچھ کہہ سکتی ہوں اور نہ کچھ کر سکتی ہوں۔۔۔ مگر دعا تجھ سے مانگ رہی ہوں میں، یارب۔۔۔ مجھے صبر دے۔ میرے دل کو سکون اور چین دے۔"، وہ روتی جا رہی تھی اور کہتی جا رہی تھی۔ دل میں آنسوؤں کے پہاڑ بسے تھے اور وہ روز اس وقت اللہ کے سامنے ٹوٹ کر ان پہاڑوں میں کمی کرتی

تھی۔اذیت کم تو نہیں ہوتی تھی مگر دکھ بانٹنے کے لیے اسے اللہ ہی چاہیئے ہوتا تھا۔

اور اللہ سے دکھ بانٹنا کسی انسان کے سامنے ٹوٹنے سے زیادہ اچھا ہے!

☆☆☆

فجر کی اذانیں ہر سو فضا میں گونجنے لگیں تو وہ بمشکل زمین سے اٹھتی اپنا تکلیف سے چور ہوتا جسم لیے چھوٹے چھوٹے قدم لیتی واش روم کی جانب بڑھی۔واش روم میں جا کر کنڈی چڑھائی اور دکھتے جسم کے ساتھ چلتی ہوئی نل تک گئی اور نل کھول ڈالا۔

اگلے ہی لمحہ نل سے پانی تیز دھار سے بہنے لگا تھا۔وہ بخار سے تپتے جسم پہ وضو کرنے کو پانی ڈالنے لگی تو کپکپاہٹ بڑھ گئی۔وضو کر کے باہر نکلی اور میز پر سے جائے نماز اٹھا کر اوپر چھت کی جانب بڑھ گئی۔

اوپر چھت سے آسمان دیکھنے لائق تھا۔ہر جانب سیاہ و سرمئی سے بادلوں نے وسیع سے افق کو ڈھک رکھا تھا۔بارش البتہ رک چکی تھی۔آس پاس کے گھروں کی دیواریں اور چھتیں بارش

سے گیلی سی لگ رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہواؤں کے جھونکے جسم پہ آ کے لگتے گویا تازگی سی بخش رہے تھے۔ وہ تپتا ہوا جسم گھسیٹتی خود کو آگے بڑھا لے گئی اور چھت کی منڈیر سے کچھ ہی فاصلے پر جائے نماز بچھائی اور دوپٹہ چہرے کے گرد باندھ کر شانوں پہ پھیلائے، نماز پڑھنا شروع کی۔

سماعتوں میں چڑیاؤں اور کوئلوں کی ملی جلی آوازیں رس گھولنے لگی تھیں۔ ساری تھکاوٹ، ساری کمزوری اور ناتوانائی عنقا ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ نماز پڑھتی، رکوع اور سجدہ میں جاتی، سلام پھیرتی، ہر گزرتے لمحہ کے ساتھ خود کو، اپنے دل و دماغ کو پر سکون ہوتا محسوس کر رہی تھی۔

www.novelsclubb.com

سنتوں کے بعد فرض رکعتیں پڑھ کے سلام پھیرا اور اگلے ہی پل وہ سجدہ میں جھکتی، جبین فرش سے ٹکائے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ خاموش پڑی فضا میں جہاں چڑیاؤں اور کوئلوں کی آوازیں گونج رہی تھیں، وہیں اس کے رونے کی آوازیں بھی ان آوازوں میں گھل گئی تھیں۔

جسم ہچکولے کھاتا اس کی ہر ایک سسکی کے ساتھ ہل رہا تھا۔ وہ جبین ٹکائے آنسو بہاتی جا رہی تھی۔ آنسو روکنا گویا خود کے بس کی بات لگ ہی نہیں رہی تھی۔ ہلکی نیلی سی روشنی ہر سو چھانے لگی تھی۔ آسمان دھیرے دھیرے تاریکی سے روشنی کا سفر کر رہا تھا، مگر وہ سب سے بیگانہ، بس روئے ہی جا رہی تھی۔

"میرے اللہ تعالی۔۔۔"، اس کے لبوں سے یہ الفاظ آزاد ہوئے تو وہ سجدہ میں ہی مزید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ خون اندر ہی اندر ابلتا محسوس ہو رہا تھا۔

"میں آج، اس لمحہ، تجھ سے ایک دعا کرنے یہاں تیرے در پہ حاضر ہوئی ہوں۔۔۔ میری یہ دعا قبول فرما دینا۔۔۔ (آنسو جائے نماز کو گیلا کرتے جا رہے تھے) مجھے صرف ارتضی مراد کا کرنا اور ارتضی مراد کو میرا کرنا۔ میری زندگی کے غموں کی مدّت ختم کر دے، میرے اللہ۔ میری زندگی میں خوشیوں کے رنگ بھر دے۔ مجھ پر کرم کر، میرے اللہ۔۔۔ تجھے تیرے محبوب رسول کا واسطہ ہے۔"

دور کہیں آسمانوں میں سے آخری آسمان کے پار حزن و غم ختم کرنے کا حکم سنا دیا گیا۔

راحت اور آسودگی کے پہر لکھ دیئے گئے۔ صحیح وقت تو پہلے سے ہی طے شدہ تھا۔اب آسمانوں پر بھی اس عبد کے غم چھٹانے کا اعلان کر دیا گیا۔

ہاہ مگر، وہ راستہ بھی شروع ہو گیا۔۔۔ہاں وہی راستہ جو خوشیوں تک جاتا تھا۔ہاں وہی راستہ جس کے قدم قدم پر الم و رنج تھے۔ہاں وہی راستہ جس کی منزل خوبصورت تھی۔

کافی دیر تک اشک بہاتے رہنے کے بعد ایمان زاویار دھیرے سے کھڑی ہوئی، جائے نماز تہہ کر کے چارپائی پہ رکھی اور چلتی ہوئی چھت کے پچھلی طرف والی منڈیر تک آ گئی۔منڈیر پر ہاتھ رکھ کر ایک نظر سامنے بھورے رنگ کے گھر کو دیکھنے کے بعد وہ جونہی مڑنے لگی، سامنے بھورے رنگ والے گھر کی چھت پہ بنا لوہے کا دروازہ باہر کی جانب کھلتا چلا گیا تھا۔

ہلکی پھلکی سی بھوری ٹی شرٹ اور سیاہ ٹراؤزر پہنے، بال ماتھے پہ بکھیرے، وہ تازہ دم سا اپنی چھت پر آیا تھا۔ چھت پہ قدم رکھتے ہی نگاہ بے ساختہ اسی کی جانب اٹھی تھی۔ پھر ورزش کا ارادہ ترک کرتا وہ اسی جانب چلا آیا تھا۔منڈیر پر ہاتھ رکھ کر اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرایا تھا۔

وہ مسکرا بھی نہ سکی تھی!

جبھی ارتضی نے اس کے سرخ سوجے ہوئے پپوٹے غور سے دیکھے تو اگلے ہی لمحہ پریشانی سے کچھ قریب سا ہوا۔

"آنکھوں پہ کیا ہوا ہے؟"، اس نے ہلکی آواز میں پوچھا تھا۔ ایمان کے گلے میں گلٹی ڈوب کر ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے مڑ کر چارپائی سے جائے نماز اٹھاتی، تیز قدموں سے نیچے چلی گئی تھی۔ پیچھے اپنی چھت کی منڈیر کے ساتھ کھڑا وہ کافی کشمکش کا شکار ہوا، وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

کچھ ہی لمحوں بعد اس کی جیب میں پڑا اس کا موبائل تھرتھرایا تھا۔ اس نے جیب سے موبائل نکال کر دیکھا تو ایک میل آیا ہوا تھا۔ بے ساختہ ہی تیزی سے اس کے ہاتھ اس میل کو کلک کر کے اوپن کر چکے تھے۔ میل لندن کی کوئین میری یونیورسٹی کی جانب سے موصول ہوا تھا۔

جوں جوں وہ اس میل کو پڑھتا جا رہا تھا، چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوتے جا رہے تھے۔ چہرہ کھل اٹھا تھا۔ میل میں صاف لکھا تھا کہ اسے لندن کی کوئین میری یونیورسٹی میں فلی فنڈڈ اسکالرشپ پہ ایڈمیشن مل گیا ہے۔ دو ہفتے بعد اس کی کلاسس شروع ہو رہی تھیں اور اس سے پہلے پہلے لندن پہنچنا تھا۔ وہ خوشی سے اچھلتا ہوا ابھی جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ میل کا کھلا پیج غائب ہوا تھا۔

اسکرین پہ کوئی غیر شناسا سا نمبر جگمگا رہا تھا۔ ہاتھ خود بخود کال ریسیو کر چکے تھے۔ اس نے فون کان سے لگایا تو اسی پل اسے ایمان اپنی چھت پر واپس آتی دکھائی دی تھی۔ یونہی چہرے کے گرد دوپٹہ باندھے، کان سے فون لگائے، وہ سیدھ میں اسے ہی دیکھتی، پچھلی جانب والی منڈیر تک چلی آئی تھی۔ ارتضی نے کچھ حیرت اور نا سمجھی سے اسے دیکھ کر کان سے فون اٹھا کر موبائل کی اسکرین کو دیکھا تھا۔

پھر دوبارہ کان سے فون لگائے ابھی کچھ بولنے ہی والا تھا کہ اگلی جانب سے ایک ٹوٹی بکھری سی آواز گونجی تھی۔

"ابا میری شادی کر رہے ہیں، ارتضی۔"، آواز ایمان کی تھی۔ وہ پہچان گیا تھا۔ سامنے کھڑی وہ بھی لب ہلکے سے ہلا رہی تھی۔ مگر اسے تو اس کے الفاظ سن کر اپنے کان سن پڑتے محسوس ہوئے تھے۔ سماعتوں میں گویا ایک زہر سا تھا جو گھولا گیا تھا۔ ایک درد سا تھا جو دل میں اٹھتا محسوس ہوا تھا۔

اس نے بے ساختہ ہی منڈیر کا سہارا لے کر خود کو کھڑے رکھا تھا۔

"ک۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو یہ؟"، اس نے بمشکل تنگ پڑتی سانسوں کے درمیان دھیرے سے پوچھا تھا۔ اگلی جانب سے ایمان کی سسکی ابھری تھی۔ وہ بے دم سی ہو کر منڈیر کے ساتھ ہی ٹیک لگا کر زمین پہ بیٹھتی چلی گئی تھی۔ اگلی جانب وہ بھی اپنی منڈیر سے پشت ٹکائے، بے دم سا ہو کر بیٹھتا چلا گیا تھا۔

"ابا کے دوست کے بیٹے ہیں، عامر۔ انہوں نے رشتہ مانگا تھا۔ ابا نے ہاں کر دی ہے انہیں۔"، وہ رونے کے درمیان کہتی جا رہی تھی۔ اور ارتضی مراد بھاری ہوتی سانسوں کے درمیان بیٹھا اسے سن رہا تھا۔ آنکھیں نم سی ہو رہی تھیں۔ فون تھامے ہاتھ میں لرزش سی تھی۔

"اب؟"،اس نے بمشکل پوچھا تھا۔لہجہ آس لیے ہوئے تھا۔کوئی چھوٹی سی امید، کوئی آس، کوئی دلاسا؟

"تم۔۔۔تم کچھ کرو،ارتضی۔روکو اس سب کو۔میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔"،ایمان نے سسکتے ہوئے دکھتے گلے کے ساتھ یہ الفاظ کس مشکل سے ادا کیے تھے،اس کے علاوہ صرف اس کا رب ہی جانتا تھا۔

"اچھا۔۔۔تم۔۔۔تم فکر نہ کرو۔میں آج ہی اماں کو بھیجتا ہوں بات کرنے۔رشتہ لے کر آئیں گی وہ۔فی الوقت منگنی کر دیں گے پھر پڑھائی ختم ہونے کے بعد شادی۔۔۔ٹھیک ہے؟"، وہ صرف اسے ہی نہیں، خود کو بھی تسلی دے رہا تھا۔خود کو زبردستی یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔کچھ غلط نہیں ہو گا۔

"ابا اپنی بات سے نہیں پھریں گے،ارتضی۔۔۔مجھے تو لگتا ہے کہ آج وہ لوگ آئیں گے بھی۔۔۔شاید نسبت طے کرنے۔مجھے بچا لو ارتضی۔مجھے بچا لو،پلیز۔"،وہ بہتے آنسوؤں کے

درمیان اذیت میں گھری کہہ رہی تھی۔اس سے فریاد کر رہی تھی۔التجا کر رہی تھی۔اور وہ اس سے بھی بری حالت میں،اس سے بھی زیادہ اذیت میں گھرا بیٹھا تھا۔

دھیمی روشنی والے ستارے آسمان سے غائب ہوتے ہوئے انہیں افسوس سے تک رہے تھے۔روشنی پھیلنے لگی تھی۔تاریکی غائب ہونے لگی تھی۔دن کا آغاز ہو گیا تھا،یا شاید ان کی جدائی کا بھی۔

☆☆☆

کراچی کی سرزمین پر بھی یہ نیا دن کافی اجلا اجلا سا اترا تھا۔وہ اس وقت لان میں بیٹھی صبح کی چائے پی رہی تھی۔فیروزی رنگ کے سادہ سے لباس کے ساتھ ہم رنگ دوپٹہ شانوں پہ ڈالے،بال ڈھیلے جوڑے میں مقید کیے،وہ سرخ و سپید چہرہ لیے کسی غیر مرئی نقطے کو تک رہی تھی۔لب سیدھ میں سی رکھے تھے۔آنکھیں اور چہرہ بے تاثر سا تھا۔

آج آسمان پر مون سون کے بادلوں کا آنا جانا تھا۔کوئی کوئی بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا آتا،ہلکی

پھلکی پھوار کرتا،اور خدا حافظ کہتا چلتا بنتا۔ کراچی والوں کو تو اس سب کی ویسے بھی عادت سی تھی۔

"باجی۔۔۔باجی۔"، جبھی اندر سے ثمرین بلند آواز میں اسے پکارتی ہوئی باہر لان میں ہی چلی آئی تھی۔چائے کا کپ سامنے پڑی میز پر رکھ کر غزل نے فرصت سے چہرہ پھیر کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔پچھلی رات دونوں کی کیا بات، کیا بحث، کیا تیز کلامی ہوئی تھی، وہ دونوں سب بھلائے ہوئے تھیں۔

ثمرین چلتی ہوئی آکر دھپ سے اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھی تو وہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ثمرین اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح مسکرائی تھی۔

"باجی۔"،اس نے ٹانگیں ہلا کر کچھ لاڈ سے کہا تو غزل نے ایک ابرو اچکا کر اسے دیکھا اور آگے ہوتے ہوئے میز سے کپ اٹھایا۔پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کپ لبوں سے لگایا اور ابرو اچکائی۔یہ اس بات کا عندیہ تھا کہ "ہاں کہو جو کہنا ہے!"

"باجی، میرے نا، ماموں جان آرہے ہیں حیدر آباد سے۔"، ثمرین نے بات کا آغاز کیا تو وہ سمجھ کر سر ہلانے لگی۔

"تو؟"، پھر چائے کا کپ خالی کر کے سامنے میز پر رکھا اور فرصت سے اس کو دیکھا، جس کے چہرے پر دبی دبی سی خوشی کے آثار تھے۔

"تو یہ۔۔۔ کہ ان کے ساتھ میرا بچپن کا منگیتر، جبران بھی آرہا ہے۔۔۔"، اب کے ثمرین نے نگاہیں جھکا کر ذرا تیزی سے بات مکمل کی تو غزل ہلکا سا مسکرائی۔

"تو مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"، اس نے اب کے ابرو اچکا کر پوچھا تھا۔

"چھٹی!"، جواب جھٹ سے آیا تھا۔ غزل نے ایک گہرا سانس لے کر اسے دیکھا تھا۔۔۔ چند پل اسے یونہی تنگ کرتی نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے ہلکا سا مسکرا کر سر ہلایا تھا۔ آنکھیں اب بھی نہ مسکرائی تھیں۔ ثمرین خوشی سے اچھلتی کھڑی ہوئی تھی۔

"تھینک یو باجی۔ یو آر سو گریٹ!"، وہ مسکرا کر بولی تھی۔ غزل نے ہلکا سا مسکرا کر کپ پھر سے لبوں سے لگایا تھا۔ آنکھوں کی ویرانی اب بھی ویسی ہی تھی۔

"اوکے، مگر صرف دو دن کی۔ تم جانتی ہو نا کہ میں گھر پر اکیلی ہوتی ہوں۔"، غزل نے اپنے ازلی نرم لہجے میں آہستہ سے کہا تو ثمرین مسکرا دی۔

"میں تو ایک دن کی چھٹی لینے کے لیے آئی تھی۔ مگر اگر آپ اتنی ضد کر ہی رہی ہیں تو ٹھیک ہے، ایک دن اور چھٹی کر لوں گی۔"، ثمرین نے خوب ہاتھ جھلا کر مزے سے آنکھیں مٹکا کر کہا تو غزل دھیرے سے ہنس دی۔

"ویسے باجی۔۔۔پرسوں تو عالم صاحب آ رہے ہیں۔ میں ایسا کروں گی کہ کل ہی آنے کی کروں گی، ٹھیک ہے؟"، ثمرین نے اچانک ہی کافی سوچ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ کچھ پل کے لیے چپ ہو کر سوچنے لگی، اور پھر سر اثبات میں ہلاتی، جیسے اس بات کے لیے رضامندی دینے لگی۔

"ویسے باجی، ایک بات کہوں؟"، کچھ پلوں کی خاموشی کے بعد ثمرین نے ایک بار پھر اپنی زبان میں ہوتی کھجلی کے سبب بولا تو غزل اسے دیکھنے لگی۔

"ابھی چند ہی دنوں میں کیس فائل ہو کر میڈیا پر جائے گا۔۔۔پھر تو وہ لوگ آپ کو اور ارحم بابا کر نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کریں گے، ہے نا؟"، اس نے اپنی پوری عقل لگا کر بڑی پتے

کی بات کی تھی۔ غزل نے صرف سر ہلایا تھا۔ پھر چند پل خاموش رہنے کے بعد بولی تو آواز میں عجب سی مضبوطی تھی۔

"جس کے ساتھ اللہ ہو، نقصان اس کے قریب نہیں آتے۔ اس کے لیے صرف نفع ہی نفع ہوتا ہے، ثمرین۔"، وہ پتا نہیں کہاں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ آنکھیں پر سوچ انداز میں سکیڑ رکھی تھیں۔ چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔

"مگر پھر رمیص صاحب۔۔۔؟"، ثمرین نے بات ادھوری چھوڑ کر گردن شرمندگی سے جھکا دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بات اسے نہیں کرنی چاہئے تھی۔ غزل نے ایک نظر اسے دیکھ کر نرمی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ ثمرین نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"رمیص صاحب کو نفع ہی تو ملا ہے، ثمرین۔۔۔ جنت اور شہادت سے بڑھ کر کوئی نفع ہو سکتا ہے کیا؟ اس کے علاوہ عوام کے دلوں میں جگہ بنانا، ان کی دعاؤں میں اپنا حصّہ رکھنا۔۔۔ یہ کوئی چھوٹی بات تو نہیں ہے نا؟"، وہ بہت محبت اور نرمی سے کہہ رہی تھی۔ آنکھوں میں انوکھی عقیدت اور انسیت ٹھہری ہوئی تھی۔ چہرہ اس پل جیسے دمکنے لگا تھا۔ ثمرین نے جیسے اس پل

اس پر خوب فخر محسوس کیا تھا۔

"رمیص صاحب تو ہمارے ساتھ ہی ہیں۔۔۔بس ہمیں ہی یہ قابلیت حاصل نہیں ہے کہ انہیں دیکھ سکیں۔۔۔شہید مرتے تھوڑی ہیں۔وہ لوگ جنہوں نے ان کے ساتھ وہ سب کیا، اگر وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ انہوں نے رمیص جہانزیب کو مار دیا، تو وہ سراسر دھوکے میں ہیں۔"، وہ آنکھوں میں محبت اور فخر کی انوکھی سی تپش لیے کہہ رہی تھی اور ثمرین ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ اور سن رہی تھی۔

"وہ زندہ ہیں، ثمرین۔۔۔وہ زندہ ہیں۔"، وہ اب آنکھیں موند کر سر کرسی سے ٹکائے ہولے ہولے بولتی جا رہی تھی۔بڑبڑاہٹ کی سی صورت اس کی آواز جیسے سرگوشی لگتی تھی۔

"وہ زندہ ہیں، مگر محسوس نہیں ہوتے۔۔۔"، اب کے اس نے بہت دھیرے سے کہا تھا۔ اتنے دھیرے سے کہ آواز خود کی سماعت تک بھی نہ پہنچی تھی۔

☆☆☆

☆☆☆

زرینہ بی اپنے گھر میں لاؤنج میں بیٹھیں اپنے سامنے سر جھکا کر بیٹھے شان کو کافی باتیں سنا رہی تھیں اور وہ ہاتھ پہلو میں گرائے پتا نہیں کیسے، مگر شرمندہ ہو رہا تھا۔ایسا ممکن تو خیر نہ تھا، مگر پھر بھی ہو ہی رہا تھا۔پتا نہیں کیسے ؟

"ذرہ برابر بھی شرم ہے تم میں ؟اتنی سی بھی ؟"،وہ دو انگلیاں قریب لائے،ایک چیونٹی جتنی جگہ چھوڑے اسے بہت ہی افسوس سے دیکھتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔"بھائی تمہارا پورا دن محنت کرتا ہے۔باپ نے اتنا اچھا کاروبار سیٹ کر کے دیا ہوا ہے، مگر مجال ہے جو تم میں ذرا بھی غیرت جاگ جائے۔یہ نہیں ہوتا کہ باپ کا ہاتھ ہی بٹا دو تھوڑا۔سدا کا کاہل اور سست انسان ہے۔"

"ماں جی،راشن کی دکان کون سا کاروبار ہوتی ہے ؟"،شان نے ان کی بات پہ تنک کر کچھ روہانسے لہجے میں کہا تو زرینہ بی نے اسے ایسا گھورا تھا کہ دوبارہ اس کی ہمت نہ ہو سکی نگاہیں اٹھا کر

انہیں دیکھنے کی بھی۔

"راشن کی دکان نہیں ہے، سپر اسٹور ہے پورا۔"، بہت ہی ضبط سے انہوں نے تصحیح کی تھی۔ پھر سب بھاڑ میں ڈال کر اٹھ کر اس تک آئی تھیں۔ شان نے تیزی سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا جو اب اس کے سر پہ کھڑی، اس کا کان پکڑ کر مروڑتے ہوئے غصّہ سے ہانپتے ہوئے بول رہی تھیں۔

"آج سے جائے گا تو اپنے بابا جی کے اسٹور۔ سنا یا نہیں؟"، بلند آواز اور سخت لہجہ میں کہا تو شان سرعت سے اثبات میں سر ہلاتا، بمشکل جان چھڑواتا وہاں سے رفو چکر ہوا۔ وہ منہ میں بڑبڑاتی ہوئیں صوفے پہ پھر سے بیٹھی ہی تھیں کہ لاؤنج میں پریشان سا ارتضی داخل ہوا تھا۔

اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ دیکھ کر انہیں کسی انہونی کا احساس ہوا تھا۔ وہ پریشانی سے اسے دیکھتیں، فورا سے اس کی جانب پوری طرح سے مڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

☆☆☆

وہ کمرے میں بیٹھی سیاہ آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پہ ٹکائے ہوئے تھی۔حلیہ بکھرا ہوا، ملگجہ سا تھا۔آنکھیں ویران سنسان سی دکھتی تھیں۔نمی کہیں دور جا سوئی تھی۔اب وہاں محض ایک سوکھے قحط کا سا تاثر تھا۔جبھی اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر ہی رضیہ بیگم اندر داخل ہوئی تھیں۔تیز قدم لیتی وہ پلنگ پہ بیٹھی ایمان تک آئی تھیں۔

"ایمان، اٹھ جاؤ۔تمہارے ابّا کے دوست آرہے ہیں۔تیار ہو جاؤ۔گلابی والا سوٹ نکال کر رکھا ہے۔نہا دھو کر پہنو اور تیار ہو جاؤ۔"، وہ کہتی ہوئی مڑ کر جانے ہی لگی تھیں کہ ایمان نے بے ساختہ ہی ان کی کلائی تھامی تھی۔رضیہ بیگم نے ہنوز مڑے ہوئے ہی آنکھیں ضبط اور اذیت سے بند کر کے کھولی تھیں۔

"مجھے دیکھنے آرہے ہیں؟"، پیچھے وہ چہرہ جھکائے، اذیت میں گھری پوچھ رہی تھی۔ان کی کلائی تھامے اس کے ہاتھ میں لرزش تھی۔اور تو اور، اصل چیز، جس نے انہیں چونکا دیا تھا، وہ اس ہاتھ کی گرماہٹ اور تپش تھی۔

"ہوں۔"، وہ دھیرے سے مڑی تھیں اور پھر ہلکا سا سر جھکا کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں نمی آ ٹھہری تھی۔ اس کے کچھ قریب جا کر انہوں نے بہت ہی محبت اور شفقت سے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر اوپر اٹھایا۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی ویرانی دیکھ کر ان کا دل ڈوبا تھا۔ آنسو ٹپک پڑنے کو بے تاب تھے۔

"تیار ہو جاؤ، میرے بچے۔"، وہ جیسے بے بسی سے کہہ رہی تھیں۔ جیسے ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی آپشن ہی نہ ہو۔ جیسے وہ اس سے زیادہ بے بس اور بے کس ہوں۔

"امّاں!"، اس نے یونہی انہیں تکتے ہوئے ہولے سے پکارا۔

"ہمم؟ بولو۔"

"مجھے پیدا کیوں کیا تھا؟"، اور اس کی اس کپکپاتی آواز اور لہجہ نے ان کے دل کو چیر کر رکھ دیا تھا۔ لیکن الفاظ پھر بھی زیادہ ظالم ثابت ہوئے تھے۔ وہ تڑپ کر اسے خود سے لگا چکی تھیں۔ آنسو تواتر کے ساتھ آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ دبی دبی سسکیوں کے ساتھ وہ اس کا سر تھپتھپاتی جا رہی تھیں۔

www.novelsclubb.com

"ایسے مت کہو، ایمان۔"، وہ اسے روکنا چاہتی تھیں۔ اس کے لب بند کر دینا چاہتی تھیں۔ اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھنا چاہتی تھیں۔ مگر جیسے وہ خود بھی مان گئی تھیں کہ یہاں غلط وہ نہیں تھی۔ بلکہ ایمان زاویار کبھی غلط ہوا بھی نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے معاملہ میں ہمیشہ مظلوم ہی ہوا کرتی تھی۔

"نہیں امی۔ آج مجھے بتائیں۔ جب دیکھ ہی لیا تھا کہ بدصورت پیدا ہوئی ہے آپ کی بیٹی تو زمین میں کیوں نہیں گاڑھ دیا مجھے؟"، وہ اسی ویران لہجے میں کہتی جا رہی تھی۔ رضیہ بیگم کو اپنا دل پھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ سانسیں تھمتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اذیت بڑھتی جا رہی تھی۔

"تم بدصورت نہیں ہو، ایمان۔ اور یہ بات تم بھی جانتی ہو۔ خاندان کی سب سے پرکشش لڑکی ہو تم۔ کتنے ہی کزنز کے رشتے آ چکے ہیں تمہارے لیے۔ تم خود کو بدصورت کہہ کر صرف مجھے ہی نہیں، خود کو بھی دھوکہ دے رہی ہو۔"، وہ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے تکلیف میں گھری کہہ رہی تھیں اور وہ انہی ویران آنکھوں کے ساتھ بغیر روئے، سر نفی میں ہلاتی جا رہی تھی۔

بہت دیر تک سر نفی میں ہلاتے رہنے کے بعد وہ ان سے دور ہوئی تھی۔رضیہ بیگم نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔وہ دھیرے سے ان کا ہاتھ نرمی سے دباتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"آپ بے فکر ہو جائیں۔آپ کے شوہر سے ڈانٹ نہیں پڑواؤں گی آپ کو۔تیار ہو جاؤں گی۔"،وہ کہتی ہوئی مزید کچھ بھی کہے سنے بغیر وہاں سے چلی گئی تھی۔رضیہ بیگم افسوس اور دکھ میں گھری کھڑی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ لاؤنج میں سر جھکائے بیٹھی اپنے اوپر عامر زبیر کی نگاہیں صاف محسوس کر سکتی تھی۔

اسے الجھن تو بہت ہو رہی تھی مگر کیا کر سکتی تھی؟وہیں الجھی الجھی سی بیٹھی رہی۔عامر کی والدہ، صفورہ بیگم،اس کے صدقے واری جا رہی تھیں۔اس کے ساتھ بیٹھیں وہ مسلسل اس کی تعریفیں کر رہی تھیں۔

ایمان نے لاؤنج میں داخل ہوتے سمے صرف ایک نظر عامر زبیر پہ ڈالی تھی۔بس!اس کے بعد اس کا ایک بار بھی دل نہ چاہا تھا نگاہ اٹھا کر اسے دیکھنے کا۔ تیس پینتیس سال تک وہ لڑکا نہیں، آدمی تھا۔ گندمی رنگت اور مناسب نقوش کا حامل وہ بہت ہی عام سا دکھتا تھا۔ چہرہ سے مسکراہٹ جدا ہو ہی نہیں رہی تھی۔ سفید شلوار قمیض پہنے، ہاتھ باہم ملائے وہ مسلسل اسے دیکھے جا رہا تھا۔

ایمان کو کوفت ہو رہی تھی۔ صفورہ بیگم مسلسل اس سے کچھ نہ کچھ پوچھے جا رہی تھیں جن کے جواب میں وہ محض چپ رہنے پر اکتفا کر رہی تھی۔اسے اس وقت بہترین چیز یہی لگ رہی تھی۔ صفورہ بیگم نے اشاروں میں عامر سے پوچھا تو اس نے جھٹ سے سر اثبات میں ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کی۔

"دیکھئے رضیہ بہن۔ ہمیں تو آپ کی بیٹی بہت پسند آئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ نکاح کی تاریخ فکس کر دیں۔"، صفورہ بیگم نے بہت ہی چاہ سے کہا تھا جس پہ کچھ جھینپ کر مسکرانے کے بعد رضیہ بیگم نے ایک نظر سر جھکا کر بیٹھی ایمان کو دیکھا تھا۔ان کی آنکھوں میں نمی آ ٹھہری

تھی۔وہ اس کی قلبی کیفیت سے واقف تھیں۔

عامر کی والدہ نے خوشی سے چمک کر اپنے ہاتھ کی انگلی سے اپنی ساس کی دی ہوئی سونے کی انگوٹھی اتاری تھی اور ایمان کا نازک سا ہاتھ تھاما تھا۔ایمان کے دل کی دھڑکن مس ہوئی تھی۔اس نے بے ساختہ ان کے ہاتھ میں موجود اپنے ہاتھ کو دیکھا تھا، جس میں اب وہ انگلی پہنا رہی تھیں۔اس نے اندر ہی اندر بہت سے آنسو اتارے تھے۔

دکھ اور اذیت بڑھتی محسوس ہوئی تھی۔چہرہ اور پلکیں اٹھانا دنیا کا مشکل ترین امر لگ رہا تھا۔وہ خود پہ ضبط اور برداشت کے کڑے پہر بٹھا کر یونہی ڈھیٹ بنی بیٹھی رہی۔اس لمحہ اسے اپنا دل مرتا محسوس ہو رہا تھا۔محسوس ہو رہا تھا کہ گویا آج اس لمحہ سب ختم ہونے کو ہے۔ایمان زاویار خود بھی ختم ہونے کو ہے۔

صفور بیگم نے انگوٹھی پہنا کر محبت سے اسے خود سے لگایا تھا۔وہ کسی بے جان شے کی طرح ان سے آ لگی تھی۔موت واقع ہو چکی تھی۔دل مردہ ہو چکا تھا۔ماتم کی ابتداء ہو چکی تھی۔سوگ

منایا جانے لگا تھا۔اور وہ۔۔۔وہ پتھر کا بت بنی ساکت بیٹھی تھی۔جامد۔۔۔پتھر!

سب مسکرا رہے تھے۔گلے مل رہے تھے۔بات پکی ہونے کی مبارکبادیں دے رہے تھے۔اور اسے۔۔۔اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے سب اس کی تباہی اور بربادی پر خوش ہو رہے ہوں۔اس کی قسمت پھوٹنے پر خوشیاں منا رہے ہوں۔اس کی زندگی اجڑنے پر چہک رہے ہوں۔

آج اس کے گھر والوں نے اس کی بربادی لکھ دی تھی اور وہ۔۔۔وہ کمبخت اتنی ڈھیٹ تھی کہ ایک آنسو بھی نہیں بہایا تھا۔کسی مجسمے کی طرح بیٹھی کوئی بے جان چیز معلوم ہو رہی تھی۔جسے نہ اپنا کوئی ہوش تھا نہ اپنی اجاڑ ہوتی زندگی کا!

www.novelsclubb.com

لاپرواہ۔۔۔بے نیاز۔۔۔ڈھیٹ!

☆☆

شام نے کراچی پر اپنے پر پھیلائے تو وہ اپنی بالکونی میں نکل آئی۔ایک ہاتھ کی انگلی ارحم نے اپنے ننھے سے ہاتھ سے تھام رکھی تھی جبکہ دوسرے ہاتھ میں تسبیح کاؤنٹر پکڑے،وہ لب ہلاتی

اس کا بٹن دباتی جا رہی تھی۔ارحم کو لے جا کر اس نے کرسی پر بٹھایا اور خود دوسری کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"ہاں جی۔۔۔کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟"،اس نے نرمی سے ہلکا سا مسکرا کر ارحم کی جانب جھک کر اس کا گال چھوتے ہوئے کہا تو ارحم مسکرایا۔

"مجھے کسی پرافٹ کی کہانی سنائیں نا، مما۔بابا تو اب ہیں ہی نہیں سنانے کے لیے۔"،ارحم نے ننھی سی باریک آواز میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا کر کہا تو وہ ایک پل کے لیے ٹھہر سی گئی۔وہ ارحم کی رمیص سے اٹیچمنٹ کے بارے میں اچھے سے جانتی تھی۔ارحم رمیص سے بہت کلوز تھا۔اور اب جب اتنے مہینوں سے اس نے رمیص کو نہیں دیکھا تھا، تو وہ بھی ڈسٹرب رہنے لگا تھا۔

شاید وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ بابا اب نہیں آئیں گے۔غزل کے دل کو بے ساختہ ہی کچھ ہوا تھا۔اس نے نرمی سے ارحم کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی سے اٹھایا اور پھر اسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھایا۔پھر کرسی سے ٹیک لگا کر اسے دیکھ کر ذرا جھک کر اس کا بھرا بھرا سا گال چوما۔

"ہمم؟تو کون سے پرافٹ کی اسٹوری سنے گا ارحم بابا؟"،اس نے مسکرا کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا تو ارحم کھلکھلا دیا۔وہ رمیص کی طرح یونہی ہر بات پہ کھلکھلا دیتا تھا۔

"کوئی بھی سنا دیں۔"،اس نے سرخ و سپید چہرہ پر آتے سنہری بالوں کو ننھے سے ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے بولا۔

"ہمم۔۔۔تو آج ہم سنیں گے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالی عنہ کی کہانی۔۔۔ٹھیک ہے؟"،غزل نے بات کا آغاز کیا تو ارحم اس کی جانب پوری طرح سے متوجہ ہو گیا۔

"ارحم بابا کو پتا ہے کہ امام حسین کون تھے؟"،اس نے اس کے ماتھے پر پھسل کر آتے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے پوچھا تو ارحم نے سر بے ساختہ نفی میں ہلایا۔اس کی آنکھوں میں کہانی سننے کی دلچسپی تھی۔غزل مسکرائی تھی۔

"امام حسین رضی اللہ تعالی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے نواسے تھے۔۔۔ان کی

بیٹی فاطمہ کے چھوٹے بیٹے۔"،اس نے واقعہ کی ابتداء کی تو وہ اوہ کی سی صورت لب گول کر گیا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے واقعات پہلے سن چکا تھا۔

"جب امام حسین کو کوفہ کے لوگوں نے مدد کے لیے خط لکھا، تو وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر کوفہ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ان کے ساتھ بہت سے لوگ تھے، مگر جانتے ہو؟ جب وہ کربلا تک پہنچے، تو صرف بہتر (72) لوگ باقی رہ گئے تھے۔ باقیوں نے بیچ راستے سے ہی راہ بدل لی تھی۔"،وہ نرمی سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہوئی کہتی جا رہی تھی اور ارحم سر اس کے اوپر رکھے بہت ہی غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"امام حسین وہاں اللہ کے نام کو سربلند کرنے گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہاں ان کی موت لکھی ہے، پھر بھی وہیں لڑتے رہے۔"،وہ کہہ رہی تھی جبھی خاموش بیٹھے ارحم نے یکدم ہی سر اٹھا کر اسے کچھ حیرت اور نا سمجھی سے دیکھا تھا۔

"جب انہیں پتا تھا کہ وہ وہاں مریں گے تو وہ وہاں سے گئے کیوں نہیں، مما؟"،اس نے اپنی عقل کے مطابق بہت ہی بڑا سوال پوچھا تھا۔ غزل نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

"کیونکہ اللہ کے لیے لڑنے والے موت، زندگی، سانسوں، خاندان، ہر شے سے بالاتر ہو کر سوچتے ہیں، ارحم۔ وہ اللہ کے لیے سب کچھ پس پشت ڈال دیتے ہیں۔۔۔ خود کو بھی، اپنے گھر والوں کو بھی، اپنی جان کو بھی اور اپنی عزّت کو بھی۔"، وہ کہتی جا رہی تھی۔ ذہن کے پردوں پر کسی کا ہنستا مسکراتا چہرہ لہرایا تھا۔ آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ لب دبا کر اس نے اپنے آپ کو رونے سے بمشکل روکا تھا۔

"اچھا۔۔۔ پھر؟"، ارحم پھر سے اس پر سر رکھ کر بولا تھا۔

"کربلا کے میدان میں ان سے ان کا سب کچھ لے لیا گیا۔۔۔ ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھانجے بھتیجے۔۔۔ سب! مگر وہ اور ان کا خاندان پھر بھی ڈٹا رہا۔"، وہ بولی تو اب کے ایک گرم گرم آنسو پلکوں کی باڑ کو توڑتا ہوا گال پر سے لڑھکتا چلا گیا۔

"کیوں؟"، سوال آسان تھا۔ جواب بھی!

"اللہ کے لیے، بیٹے۔"، اس نے محبت سے اس کا گال چومتے ہوئے کہا تھا۔

"میرے بابا کی طرح؟"،اورارحم کی اس بات پہ وہ ساکت ہوئی تھی۔وہ ننھا سا بچہ بھی بہت کچھ سوچتا رہتا تھا۔اسے آج اندازہ ہوا تھا۔

"آپ سے کس نے کہا یہ؟"،اس نے بہت ہی حیرت سے آنکھوں سے ٹپکتے آنسوؤں کے درمیان پوچھا تھا۔

"بابا نے۔"،اس نے فٹ سے جواب دیا تو غزل ایک بار پھر بے یقین ہوئی تھی۔رمیص نے؟ مگر کب؟

"بابا نے؟ مگر کب؟"،سوال خود بخود اس کی زبان سے پھسلا تھا۔

"کل۔۔۔کل کہا تھا انہوں نے۔"،وہ بہت ہی معصومیت سے اس کے دوپٹہ کو مروڑ کر اس سے کھیلتے ہوئے بولا تھا۔

"کل کیسے؟"،وہ بے یقین ہوتی اسے سن رہی تھی۔۔۔سن سی ہوئی! آنکھوں میں نمی کے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ بہت ہی زیادہ حیرانگی بھی سمو رکھی تھی۔

"میرے ڈریم میں آئے تھے بابا۔تب کہہ رہے تھے!"،بلا کی معصومیت سے آنکھیں

پٹپٹا کر ارحم نے جواب دیا تو وہ جو ابھی کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھی، یکدم ہی چپ سی ہو گئی۔ ارحم چھوٹا بچہ تھا۔ وہ ایسی کوئی بات کر بھی رہا تھا تو وہ کیسے پتا نہیں کیا کیا سوچنے لگی۔

"اچھا۔۔۔اب آپ ایسا کریں کہ ثمرین بی بی کے پاس جا کر ان سے کہیں کہ آپ کو کھانا کھلا دیں۔ جب تک میں اپنا کچھ ضروری کام کر لوں۔ ٹھیک ہے؟"، محبت سے اس کا گال چوم کر بولی تو وہ چہک کر سر ہلاتا، اس کے گال کو چومتا ہوا اندر کی جانب دوڑ گیا۔ پیچھے اس نے ایک گہرا سانس لے کر آسمان کو دیکھا تھا۔

شہید زندہ ہوتے ہیں تو ہمیں دکھتے کیوں نہیں ہیں؟ محسوس کیوں نہیں ہوتے؟ ذہن میں کہیں سے یہ سوچ یونہی آ گئی تھی۔ سر جھٹک کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

رات کی خاموش فضا میں کہیں سے جھینگر کی آوازیں گونجتی رات کو ایک عجب سا ماحول

دیتی تھیں۔آسمان پر گہرے سرمئی سے بادل آسمان کی سیاہی میں چمکتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ٹھنڈی،پر سوز ہوائیں چلتی ایک عجب سا ماتم کا گیت چلائے ہوئے تھیں۔کم از کم اسے تو یہی لگ رہا تھا کہ زمین و آسمان،چرند پرند،ستارے،سب اسی کے غم میں مدھم و غم زدہ سے ہو رہے ہیں۔

آج تو ستارے بھی شاید کم جھلملا رہے تھے۔اور چاند۔۔۔چاند تو اس کے غم میں روتا اپنے آشیانے میں ہی دبکے بیٹھا تھا۔وہ سیاہ آسمان کی چھت تلے چارپائی پہ بیٹھی،ویران آنکھوں سے آسمان کو تک رہی تھی۔ذہن اور دل میں ایک سناٹا،ایک ویرانی سی تھی۔روح کو کسی رنج والم نے اپنے جکڑ میں لے رکھا تھا۔

www.novelsclubb.com

سیاہ رنگ کے سادہ سے کپڑے پہنے،سیاہ دوپٹہ اپنے برابر ہی چارپائی پہ رکھے،وہ الجھے بالوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔آج وہ ختم ہوئی تھی۔۔۔یا شاید اس کا دل ختم ہوا تھا۔کون پہلے ختم ہوا تھا،یہ بتانا ذرا مشکل تھا۔وہ چپ چاپ بیٹھی آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ذہن میں کچھ سالوں پہلے واقع ہوا ایک منظر عود کر آنے لگا تو وہ بازوؤں کی قینچی بنا کر سر تلے رکھ کر چارپائی پہ ہی

لیٹتی چلی گئی۔

دو سال پہلے۔۔۔

موسم سرما تھا۔ ٹھنڈ اس بار خلاف معمول بڑھی ہوئی تھی۔ ایسے میں وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ ہلکا پھلکا میک اپ کیے، سرخ رنگ کا کام والا جوڑا زیب تن کیے، وہ جیسے کسی شادی میں جانے کو تیار لگتی تھی۔ لگتا تو یہی تھی!

ایسے میں فاطمہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ بھی صاف ستھرے سے حلیے میں کافی سلجھی ہوئی اور اچھی لگ رہی تھی۔ ہاتھ میں فون تھام رکھا تھا جو وہ اسی کی جانب لیتی آ رہی تھی۔ سن سی بیٹھی ایمان نے ایک نظر اٹھا کر اسے، اور پھر اس کے ہاتھ میں تھامے موبائل کو دیکھا تھا۔ آنکھوں میں سوال ابھرا تھا۔

"آدم بھائی ہیں۔ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"، فاطمہ کہہ کر فون اسے تھماتی، مڑ کر واپس چلی گئی تھی۔ ایمان نے ایک گہرا سانس لے کر فون کان سے لگایا تھا۔

"ہیلو۔۔۔السلام علیکم، بھائی۔"،اس نے تھکاوٹ سے چور لہجے میں سلام کیا تو اگلی جانب اپنے ہاسٹل روم میں بیٹھے آدم نے سیدھے ہو کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگایا تھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔کیسی ہو؟"،نہایت روایتی سا یہ جملہ بھی اس وقت ایمان کو حوض کوثر کی مانند لگا تھا۔چلو، کوئی اس سے بھی پوچھ رہا تھا کہ وہ کیسی ہے۔۔۔کوئی تو تھا جسے اس کا خیال تھا۔۔۔کوئی تو تھا جسے فکر تھی کہ وہ کیسی ہے!اس نے اندر ہی اندر بہت سے آنسو اتارے تھے۔اور منہ پر مسکرادی تھی۔

"سچ بولنا ہے یا جھوٹ؟"،بہت ہی ہمّت کر کے اس نے یہ جملہ ادا کیا تو اگلی جانب وہ جیسے چپ سا ہو گیا تھا۔پھر جب بولا تو آواز میں وہی گھمبیرتا تھی جو اس کی آواز اور شخصیت کا خاصہ تھی۔

"مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔"،ایمان دھیرے سے نم آنکھوں کے ساتھ مسکرادی تھی۔

"جب زرار بھائی نے میرے لیے کچھ نہیں کیا تو آپ کیا کریں گے؟"، اب کے وہ ذرا تلخی سے بولی تھی۔ تکلیف تو تھی ہی۔ کسی کے سامنے تو عیاں ہونی ہی تھی نا!

"زرار اور مجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے، ایمان۔ نہ میں اس کے جیسا ہوں اور نہ وہ میرے جیسا۔"، بہت ہی سنجیدگی سے آدم نے اپنی بات مکمل کی تو اگلے ہی پل وہ جو اپنے آنسو نہ جانے کتنے ہی دنوں سے دبائے بیٹھی تھی، اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آدم نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

"اچھا تم روؤ مت۔۔۔ اور مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا ہے؟"، اسی سنجیدگی اور صوبر سے انداز میں آدم نے پوچھا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا، بہت ہی کم گو۔۔۔ سیدھی مطلب کی بات کرنے والا۔ اسے لمبی لمبی تمہیدیں باندھنی نہیں آتی تھیں۔ وہ مختصر جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جانے والا تھا۔

"مجھے شادی نہیں کرنی، بھائی۔۔۔ میں تھک گئی ہوں۔"، تھکاوٹ سے چور لہجے میں بہت ہی بے بسی سے اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ آنسوؤں نے چہرہ پورا بھگو دیا تھا۔ اس نے اپنی

بات کہہ دی تھی۔اس کے پاس کہنے کو اور کچھ نہیں تھا۔دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔سسکیاں کمرے میں گونجنے لگی تھیں۔

آدم نے سر یوں اثبات میں ہلایا تھا جیسے وہ اس کے سامنے بیٹھی اسے دیکھ رہی ہو۔اس کے چہرے اور آنکھوں کی سنجیدگی خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔یوں جیسے اس کے دماغ نے انتہائی فیصلہ لے لیا ہو۔اب کے جب وہ بولا تو آواز سے کچھ پل پہلے والی نرمی بالکل عنقا تھی۔وہاں صرف سنجیدگی کے ساغر رواں تھے۔

"اوکے،ایمان۔میں نے تمہاری بات سن لی ہے۔اب تم میری بات سنو۔۔۔تمہارے لیے ہمیشہ کوئی اور نہیں آئے گا۔۔۔ہمیں اپنے لیے جو کرنا ہوتا ہے،خود ہی کرنا ہوتا ہے۔اس وقت تم چھوٹی ہو،اس لیے تمہارا وکیل میں ہوں۔بڑے ہو کر اپنی وکالت تمہیں خود کرنی ہو گی۔میں بولوں گا تو ڈٹنا تمہیں بھی ہو گا۔ثابت قدم رہ کر کھڑے رہنا ہو گا۔"،وہ اپنی ازلی سنجیدگی کے ساتھ الفاظ ادا کرتا اس کے کچّے ذہن میں بہت کچھ ڈال رہا تھا۔اور وہ چپ چاپ،آنسو بہاتی اسے سن رہی تھی۔

"آج میں لڑ رہا ہوں تمہارے لیے۔۔۔ مگر یاد رکھنا، میں ہمیشہ نہیں رہوں گا۔ کبھی نا کبھی، کہیں نا کہیں، تمہیں اپنے لیے بولنے کی ضرورت پڑے گی۔ ہمیشہ دوسروں کے فیصلوں پر نہیں چلنا ہو گا تمہیں۔۔۔ ہاں، ساتھ رہوں گا میں تمہارے ہمیشہ۔ میری طرف سے تم بے فکر رہو۔"، اب کے وہ پھر سے اسی نرمی، مگر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ایمان نے آنکھیں ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر نمی پونچی تھی۔ وہاں لندن میں بیٹھ کر بھی آدم زاویار خان نے اس کے آنسو پونچ ڈالے تھے۔

بس پھر کیا ہوا تھا۔۔۔ وہاں سے آدم نے زاویار صاحب کو فون کیا تھا۔۔۔ انہیں خاصی دیر تک سمجھانے بجھانے کے بعد ایمان کی مرضی پوچھنے کو کہا تھا۔ بڑا بیٹا تھا۔۔۔ سمجھدار۔۔۔ زاویار صاحب کو اس کی سننی ہی پڑی تھی۔ انہوں نے جب ایمان سے پوچھا تو اس نے بہت ہی ہمّت کر کے اپنی بات کہہ ڈالی تھی۔ اور تب زندگی میں پہلی بار اسے آدم سے بہت انسیت اور محبت محسوس ہوئی تھی۔ ورنہ اسے تو ہمیشہ یہی لگتا تھا کہ وہ سرد مہر سا، بے لچک سا انسان ہے جو محض اپنی دنیا میں ہی مگن رہتا ہے۔۔۔

دمکتے ستاروں کو دیکھتی سیاہ آنکھوں میں حزن کی نمی ٹھہری تھی۔دل میں شدّت سے کسی کی محبت جاگی تھی۔بھائی کی یاد آج پہلے سے کہیں زیادہ آئی تھی۔وہ ہوتے تھے تو ہمّت دلاتے تھے۔مضبوطی کے ساتھ کھڑا کرتے تھے۔

"میں مضبوط نہیں ہوں، بھائی۔۔۔میں بہت کمزور ہوں۔"،وہ سر جھکا کر اپنے باہم جڑے گھٹنوں پہ ٹکاتی ہوئی بڑبڑاہٹ کے سے انداز میں بولی تھی۔آنکھوں سے آنسو بہتے رخساروں کو بھگونے لگے تھے۔

"مجھے مضبوط بننا نہیں آتا، بھائی۔میں کمزور ہی تھی اور کمزور ہی رہوں گی۔۔۔مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے، بھائی۔"،وہ سسکتے ہوئے بولتی جا رہی تھی اور آسمان پر ٹھہرے ستاروں نے بہت ہی رنج سے اسے دیکھ کر ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔افسوس کہ وہ اس تنہا لڑکی کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے!

☆☆☆

اگلی صبح کافی اجلی اجلی سی اتری تھی۔آسمان پر چھائے گہرے سرمئی و سپید سے بادلوں نے اسے ڈھک رکھا تھا۔ایک ٹھنڈ سی موسم میں محسوس ہوتی تھی۔ایسے میں حیدر آباد میں آج صبح سے ہی ہلکی رم جھم جاری تھی۔موسم خوشگوار ہوا ہوا تھا۔

کھلے صحن کے وسط میں رکھی چارپائی پر اس وقت رضیہ بیگم بیٹھی، فاطمہ کی کس کس کے چوٹی بنا رہی تھیں۔وہ ان کے زور سے کسنے پر ہر بار چلاتی اور سر سہلانے لگتی۔

"آہستہ امی۔بہت زور سے کر رہی ہیں۔"، ساتھ ساتھ فریادیں بھی جاری تھیں۔مگر وہ تو جیسے ہتھیار اٹھا کر میدان میں اتری تھیں۔جبھی باہر کا مین گیٹ کھٹکھٹایا گیا تو انہوں نے ذرا ٹھہر کر نگاہ دروازے پر ڈالی۔پھر ایک آخری بل ڈال کر فاطمہ کی چوٹی کھینچی اور اسے شانے سے ہلایا۔

"جاؤ فاطمہ۔دروازہ کھولو۔"ان کے کہنے پر وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھی۔گویا قید سے قیدی آزاد ہوا تھا! پیچھے رضیہ بیگم نے جلدی سے چارپائی پر سے سامان سمیٹا اور ایک کونے میں رکھا۔دروازہ کھلا تو سامنے ہی زرینہ بی تھیں۔فاطمہ انہیں اندر لاتی، سلام کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

"السلام علیکم زرینہ۔۔۔ کیسی ہو بھئی؟"، رضیہ انہیں سلام کرتی، ساتھ ہی چارپائی تک لے آئیں۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئیں تو فاطمہ نے جلدی سے دو گلاسوں میں شربت لا کر سامنے رکھا۔

زرینہ بی کے چہرے پہ چھائی پریشانی اور تفکر رضیہ نے نوٹ کی تھی، مگر فی الوقت وہ چپ کر گئیں۔ زرینہ بی کی نگاہیں ادھر ادھر گھومتیں، کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ جب نگاہیں ناکام لوٹیں تو وہ مایوس ہو کر رضیہ کو دیکھنے لگیں۔

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ تم سناؤ۔ کیا حال ہیں؟"، زرینہ نے ہلکا سا رسمی طور پر مسکرا کر کہا تھا۔

"میں بھی ٹھیک ہی ہوں۔"

"اچھا رضیہ، آج میں بہت اہم کام کے لیے یہاں حاضر ہوئی ہوں۔ ہاں میں ہی جواب چاہیئے مجھے۔"، ہلکا سا مسکرا کر زرینہ بی نے بات کا آغاز کیا تو رضیہ بیگم بھی پوری طرح سے ان

www.novelsclubb.com

کی جانب متوجہ ہو کر کچھ نا سمجھی اور سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگیں۔

"دیکھو رضیہ، میرا ارتضی تو تمہارے لیے دیکھا بھالا بچہ ہے۔۔۔ بچپن سے زرار کے ساتھ کھیلتا آیا ہے۔۔۔اس کے علاوہ شان تو یہاں باقاعدہ ایمان کے پاس ٹیوشن تک پڑھ کر گیا ہے۔۔۔"، انہوں نے تمہید باندھنا شروع کی تو رضیہ نے کچھ عجیب نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔وہ کچھ کچھ اس "کام" کی نوعیت کو سمجھ رہی تھیں۔

"ہماری فیملی کو بھی اچھے سے جانتے ہو تم لوگ۔۔۔اسی لیے آج، میں تم سے اپنے ارتضی کے لیے ایمان کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔"،ان کی اس بات پہ رضیہ بیگم تو رضیہ بیگم، لاؤنج کے دروازے پہ کھڑی فاطمہ اور چھت سے اتر کر آتی ایمان بھی ساکت ہو گئی تھیں۔ایمان نے بہت ہی بے یقین نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔چونکہ وہ چھت کی دیوار کی اوٹ میں کھڑی تھی، سو وہ نیچے سے نظر نہ آتی تھی۔البتہ اسے صحن کا منظر بالکل صحیح دکھ رہا تھا۔زرینہ بہت ہی امید سے رضیہ کو دیکھ رہی تھیں جن کے چہرے کا رنگ فق ہوتا جا رہا تھا۔ان کا سانس گویا رک رک کر آنے لگا تھا۔

ایمان نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اپنے دل کے مقام پہ رکھ کر ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کیا تھا۔اس کی آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی امڈ آئی تھی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولہ اٹکنے لگا تھا۔

کافی دیر بعد رضیہ بیگم کچھ کہنے کے قابل ہوئیں تو انہوں نے بہت ہی اپنائیت بھرے انداز میں زرینہ کا ہاتھ تھاما۔ایمان کی سماعت ان کو سننے کی منتظر تھی۔وہ دم سادھے ہوئے تھی۔

"دیکھو زرینہ۔۔۔"،رضیہ نے بات کا آغاز کیا تو ایمان نے سر جھکا کر بے ساختہ دیوار کا سہارا لیا تھا۔وہ خود کو ہر شے کے لیے تیار کر چکی تھی۔انکار کے لیے بھی!

"ایمان کی زندگی میں کون آئے گا،اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے حاصل نہیں ہے۔مجھے یہ اختیار کبھی دیا ہی نہیں گیا،زرینہ۔۔۔مجھے معاف کر دو۔تم چاہو تو فاطمہ سے رشتہ کر دو ارتضی کا۔۔۔مگر ایمان۔۔۔"،بات ادھوری چھوڑ کر انہوں نے نم آنکھوں سے سر جھکا کر نفی میں ہلا دیا تھا۔جیسے یہ تو ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔ایمان تو ایمان،فاطمہ خود بھی اس بات پہ ساکت

کھڑی رہ گئی تھی۔

ایمان کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔آنکھوں کی نمی بڑھ گئی تھی۔چہرہ مزید جھک گیا تھا۔دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔آج اس لمحہ اسے بے اختیار ہی اپنی بہن سے شدید حسد محسوس ہوئی تھی۔کیا تھے اس کے ماں باپ بھی!اسے اپنی ہی بہن سے حسد کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔

"دیکھو رضیہ۔۔۔میں نہیں جانتی کہ تمہیں یہ بات معلوم ہے یا نہیں، مگر وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔۔۔ارتضی کا مستقبل انشاءاللہ بہت روشن ہو گا۔۔۔وہ ایمان کو بہت خوش رکھے گا۔"،زرینہ کی اس بات پہ جہاں ایمان اور فاطمہ ساکت ہوئی تھیں،وہیں رضیہ نے بغیر کسی ری ایکشن کے ایک گہرا بھاری سانس لیا تھا۔ان کی آنکھوں کی نمی بڑھ گئی تھی۔

"میں سب جانتی ہوں،زرینہ۔مگر میں اس سب میں بے بس ہوں۔"،اور رضیہ کی اس

بات پہ ایمان نے شاکی بے یقین نگاہوں سے سر ایک جھٹکے سے اٹھایا تھا۔ آنکھیں شدید بے یقینی کے باعث پھیل گئی تھیں۔ ایک آنسو پلکوں کی باڑ کو توڑتا، گال پہ نیچے لڑھکتا چلا گیا تھا۔ فاطمہ کی حیرت بھی کچھ کم نہ تھی۔

ابھی زرینہ مزید کچھ کہہ ہی رہی تھیں کہ باہر کا دروازہ کھلا تھا اور زاویار صاحب اندر آتے دکھائی دیئے تھے۔ سادہ سے شلوار قمیص میں ملبوس وہ بہت سنجیدہ سے لگتے تھے۔ جبھی صحن میں انہیں بیٹھے دیکھا تو مروتاً سلام کرنے چلے آئے۔

"السلام علیکم زرینہ بہن۔ کیسی ہیں آپ؟"، وہ چارپائی سے کچھ ہی فاصلے پہ کھڑے ہلکا سا مسکرا کر پوچھ رہے تھے۔ زرینہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔۔۔ وہ، آپ سے ایک بات کرنی تھی مجھے۔۔۔"، وہ بے صبری اور اضطراب سے بولیں تو زاویار صاحب نے سر ہلا کر ان کو گویا بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

"وہ۔۔۔ دراصل میں ارتضی کے لیے ایمان کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔"، بہت ہی امید

بھری نگاہوں اور تیز ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ انہوں نے کہا تو زاویار صاحب کچھ پل کے لیے بالکل ٹھہر سے گئے تھے۔آنکھیں ساکت ہوئی تھیں۔چہرہ کی سختی اور سنجیدگی بڑھی تھی۔

"آپ تشریف رکھئے،بہن۔"،وہ چارپائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسی سنجیدگی سے ایک کرسی گھسیٹ کر کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے تو زرینہ اور رضیہ بھی ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے چارپائی پہ بیٹھ گئیں۔ایمان ساکت سی کھڑی صحن کا سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

"دیکھئے میری بہن۔۔۔ارتضی بلاشبہ بہت ہی لائق فائق،صوبر اور اچھا بچّہ ہے۔بہت ہی عزّت کرنے والا،فرمانبردار۔۔۔"،سنجیدگی سے بات کا آغاز کر کے انہوں نے سیدھ میں زرینہ بی کو دیکھا تھا۔ان کی آنکھوں میں اب بھی ایک امید،ایک آس تھی۔"اگر آپ پہلے آجاتیں تو ضرور میں آپ کو مایوس نہ لوٹاتا۔۔مگر اب میں نے ایمان کا رشتہ طے کر دیا ہے۔"

دیوار تھامے کھڑی ایمان نے جلتی آنکھیں بند کر کے کھولی تھیں۔حلق درد کرنے لگا تھا۔آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی رفتار میں تیزی آگئی تھی۔چہرہ گویا دہک رہا تھا۔دل میں ایک درد سا اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔

"کل اس کی منگنی کی رسم طے پائی ہے اور ایک ہفتے بعد اس کا نکاح ہے۔۔۔اور نکاح کے ساتھ ہی سادگی سے اس کی رخصتی بھی ہو جائے گی۔"،وہ کہتے جا رہے تھے اور ایمان کو اپنا سانس رکتا محسوس ہو رہا تھا۔کوئی قطرہ قطرہ کر کے گویا اس کی روح سینچ رہا تھا۔اسے بے جان کرتا جا رہا تھا۔تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔جسم انگاروں میں دہکایا جا رہا تھا۔اور وہ۔۔۔وہ ڈھیٹ اب بھی زندہ تھی!

یہ نکاح والی باتیں تو خود رضیہ بیگم کو بھی معلوم نہ تھیں۔شاک زدہ اور حیران تو وہ بھی تھیں۔زاویار صاحب ابھی عامر کے یہاں ہی گئے تھے۔کچھ ضروری باتیں کرنے کے لیے۔۔۔مگر پتا انہیں اب چلا تھا کہ وہ ضروری باتیں یہ تھیں۔انہیں رہ رہ کر اپنی معصوم اور نازک دل سی بیٹی کا خیال ستا رہا تھا۔وہ ایک ماں ہو کر بھی کتنی بے بس تھیں نا! کیا مائیں بھی بے بس ہوا کرتی ہیں؟ہاں شاید!

"آپ سے میں بہت معذرت کرتا ہوں۔۔۔آپ لوگ نکاح میں بمع اہل و عیال ضرور شرکت کیجیئے گا،ہمیں اچھا لگے گا۔۔۔السلام علیکم!"،زاویار صاحب سنجیدگی سے اپنی بات

مکمل کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور سر کے خفیف سے اشارے سے سلام کرتے، مڑ کر اندر کی جانب بڑھ گئے تھے۔ پیچھے چار وجود اب تک ساکت سے کھڑے تھے۔۔۔ جیسے وہ بے جان ہو گئے ہوں۔۔۔ پتھر کی طرح!

وہ سیڑھیوں پر ہی بے جان سی ہوتی بیٹھتی چلی گئی تھی۔ ٹانگوں میں اور جان باقی نہیں رہی تھی۔ خود کو کھڑا کرنے کی مزید ہمّت نہیں تھی اس میں!

☆☆☆

کراچی میں آج صبح سے ہی بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ ابھی دوپہر کا وقت تھا مگر لگتا نہیں تھا۔ گہرے سرمئی سے بادلوں نے آسمان کو گھیر کر ایک اندھیرا سا کر ڈالا تھا۔ دوپہر میں بھی شام کا سا سماں تھا۔ وقفے وقفے سے ہوتی تیز دھواں دار بارش نے سب کچھ بھگو ڈالا تھا۔

ایسے میں رمیص جہانزیب کے گھر کے باہر ایک سیاہ رنگ کی گاڑی آ کر رکی تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر ایک سوٹڈ بوٹڈ سا درمیانی عمر کا آدمی، چھاتہ تھامے باہر نکلا

تھا۔ سر پر چھاتہ تانے، ہاتھ میں ایک سیاہ بریف کیس تھامے، وہ سیاہ بوٹوں کے ساتھ گھر کی جانب بڑھا تھا۔

عمر لگ بھگ چالیس برس لگتی تھی۔ سیاہ گھنی داڑھی اور مونچھوں والا وہ آدمی بہت بارعب اور سلجھا ہوا سا لگتا تھا۔ چہرہ پہ سنجیدگی کی لکیریں رقم تھیں۔

دروازے تک پہنچ کر اس نے گھنٹی بجائی اور ایک نظر اپنی کلائی پہ بندھی سیاہ ڈائل والی برانڈڈ گھڑی کو دیکھا۔ پھر منتظر سا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سیاہ پینٹ کوٹ آستینوں کی جانب سے ہلکا گیلا ہو رہا تھا۔۔۔ شاید بارش کے پانی کی وجہ سے۔۔۔

جبھی ایک کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا تھا اور دروازے میں ثمرین کا چہرہ نمودار ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سلام کر کے وہ ایک جانب کو ہوئی تو وہ سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتا ہوا قدم اندر بڑھا گیا۔ پیچھے دروازہ بند کرتی وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی اندر چلی آئی تھی۔

منظر اب سے کچھ دیر بعد کا ہے۔ ڈرائنگ روم میں ایک جانب رکھے سنگل صوفے پہ وہ

ہی آدمی بیٹھا تھا۔ جبکہ اس کے سامنے رکھے ڈبل صوفے پہ ثمرین اور غزل بیٹھی تھیں۔ غزل نے سیاہ پٹی والا نقاب باندھ رکھا تھا۔ البتہ نیچے سادہ سے سبز رنگ کے شلوار قمیض ہی پہن رکھے تھے۔

"یہ دیکھئے۔"، جبھی غزل کو ایک نظر دیکھتے ہوئے اس نے اپنا بریف کیس کھولا تھا اور اس میں سے ایک سرخ رنگ کی فائل نکالی تھی۔ فائل غزل کی جانب بڑھائی تو اس نے ہاتھ آگے کر کے فائل تھامی۔ وہ بریف کیس پھر سے پیچھے کرتا ہوا اسے دیکھنے لگا جو اب فائل کھول کر معائنہ کرنے لگی تھی۔

"رمیص جہانزیب کو ماتھے میں گولی ماری گئی تھی۔ فارینسک رپورٹ کے مطابق ان کو مارنے سے پہلے تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ ان کے تین ناخن اکھاڑے گئے تھے۔ دانت سارے توڑے گئے تھے۔ ان کی زبان کاٹی گئی تھی۔۔۔ اس کے علاوہ کھوپڑی بھی بری طرح کچلی گئی تھی۔۔۔"، وہ سنجیدگی سے کہتا جا رہا تھا اور غزل ڈوبتے دل کے ساتھ یہ ساری ناقابل برداشت باتیں سن رہی تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ خود کو یہاں سے لے جا کر کسی گہرے

جنگل یا پھر کسی گہرے سمندر کی گہرائیوں میں چھپا دے۔۔۔اس سب سے کہیں دور!

"ان کو دو دن تک کچھ کھانے پینے کو بھی نہیں دیا گیا تھا۔۔۔جس کے باعث انہیں ڈی ہائیڈریشن ہو گئی تھی۔انہیں بہت سے ڈرگز دیئے گئے تھے جن سے ان کے آرگنز اندر ہی اندر گھلنے لگے تھے۔۔۔ان کی آنکھوں میں کوئی ایسی دوائی ڈالی گئی تھی کہ وہ مرنے سے پہلے ہی اپنی بینائی کھو بیٹھے تھے۔۔۔کان کی جلد جگہ جگہ سے جلی ہوئی تھی۔"،وہ بول کر آخر میں چپ ہوئے تو ایک گہری ماتم کرتی خاموشی نے لاؤنج کی فضا کو گھیر لیا۔

غزل کی کچھ بھی بولنے کی ہمّت نہیں ہو رہی تھی۔ثمرین کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے جا رہے تھے۔اس کے رمیص صاحب کے ساتھ اتنا ظلم،اتنا تشدد؟اتنا تو کوئی کسی بے زبان جانور یا بے جان مردے کے ساتھ بھی نہیں کرتا ہے جتنا اس کے زندہ، صحیح سلامت صاحب کے ساتھ کیا گیا۔وہ کیا کہتی اور کیسے کہتی؟

"میں نے یہ فارینسک رپورٹ بھی کیس کے ساتھ اٹیچ کر دی ہے۔اس کے علاوہ وہ کال

ریکرڈنگ بھی جس میں وہ آپ سے کہہ رہے تھے کہ وہ اپنی مرضی سے وہاں نہیں گئے۔۔۔انہیں وہاں زبردستی بھیجا گیا ہے۔"،اب کے اس نے ایک گہرا نم سانس خارج کر کے کہا اور خاموش ہو گیا۔وہ شاید غزل کے بولنے کا منتظر تھا۔

غزل سے کچھ بھی بولا نہیں جا رہا تھا۔بے دم سی ہو کر اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرایا تھا۔آنسو آنکھوں سے آزاد ہوتے نقاب میں جذب ہونے لگے تھے۔

"میرے اللہ۔۔۔۔!اتنا ظلم؟"،وہ جیسے بے یقین تھی۔کیا اللہ کے لیے لڑنے والوں کا یہ انجام ہونا چاہیئے؟کیا انصاف کا پرچم بلند کرنے والوں کے ساتھ اتنی ناانصافی ہونی چاہیئے؟ہاں شاید اس ملک میں انصاف کے ساتھ کھڑے ہونے والوں کے ساتھ یہی کیا جاتا ہے۔وہ بے یقینی سے سر نفی میں ہلا رہی تھی۔

"آپ ہمّت کریں، مسز رمیص۔۔۔آپ ہی کو تو ہمّت کرنی ہو گی۔"،اس نے ہمدردی سے کہا تو غزل نے متورم سرخ آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں موجود تکلیف کوئی بھی دیکھتا تو اس کا دل کٹ کر رہ جاتا۔

"آپ مجھے بتائیں کہ مجھے کہاں سائن کرنے ہیں، عالم صاحب۔"، اب کے جب وہ بولی تو آواز میں نمی کے ساتھ ساتھ ایک مضبوطی بھی گھلی تھی۔ایک عزم سا تھا جو اس کی متورم آنکھوں میں جھلکتا تھا۔عالم نے فوراً سے ایک قلم نکال کر اس کی جانب بڑھایا اور خود بھی اٹھ کر اس تک آیا۔ ثمرین اٹھ کر اگلی جانب جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہتے جا رہے تھے۔

عالم بتاتا جا رہا تھا اور وہ سائن کرتی جا رہی تھی۔آخری سائن کرتے وقت اس کا ہاتھ ایک پل کے لیے کپکپایا ضرور تھا، مگر وہ رکی نہیں۔وہ رک بھی کیسے سکتی تھی؟ انصاف کی جنگ تک جاتی سیڑھی پر یہ پہلا قدم تھا جو غزل رمیص نے رمیص جہانزیب کے لیے رکھا تھا۔آگے نہ جانے زندگی کہاں لے جائے اسے؟ خدا جانے!

باہر برستی بوچھاڑ تیز ہو گئی تھی۔بجلیاں کڑکنے لگی تھیں۔بادل گرجنے لگے تھے۔اس کے دل کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔روح میں بھی ایک ایسا ہی شور مچا ہوا تھا۔

☆☆☆

پاسپورٹ آفس کے باہر ایک رش سا لگا تھا۔ خراب موسم ہونے کے باوجود بھی رش ایسا تھا جیسے اتنی تیز خطرناک بارش تو ہو ہی نہیں رہی۔ شام کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ روشنی جاتی جا رہی تھی۔ تاریکی غالب آتی جا رہی تھی۔ ایسے میں وہ اور روحان مین گیٹ سے باہر نکل کر آئے تو دونوں کے چہروں پر اطمینان سا تھا۔

ہاتھ میں ایک سیاہ شاپر پکڑ رکھا تھا جسے دوسرے ہاتھ سے ڈھانپا ہوا تھا۔ شاید یہ کوشش برستی بارش کی بدولت تھی۔ تیزی سے آکر وہ دونوں بائیک پر بیٹھے اور بائیک اسٹارٹ کی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مین روڈ پر رواں تھے۔ ارتضی آگے بائیک چلا رہا تھا جبکہ پیچھے روحان بیٹھا، سیاہ شاپر تھامے، ان دونوں کے بیچ بارش سے گویا چھپائے ہوئے تھا۔ بارش تیز پہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"ویسے ایک بات تو بتا، رضا۔۔۔ تیری ٹکٹیں کنفرم ہو گئی ہیں؟"، روحان نے کچھ تجسس سے پوچھا تو ارتضی نے سنجیدگی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔ روحان نے سمجھ کر سر ہلایا تھا۔

"اور گھر پہ بتا دیا سب کو؟"، اب کے روحان نے پھر سے پوچھا تو اس نے ایک بار پھر محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"اچھا۔۔۔اور اسے؟"،اور اس "اسے" کے ذکر پہ اس کو اپنا دل ہواؤں میں ڈولتا محسوس ہوا تھا۔ بمشکل دل کی بدلتی حالت پہ قابو پا کر اسے نے ایک بار پھر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

"ہمم۔۔۔اچھا!"،روحان سر ہلاتا خاموش ہو گیا تھا۔کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد زبان میں پھر کھجلی مچی تھی۔چپ رہنا محال ہونے لگا تو اس نے اگلا سوال تیار کر لیا۔

"واپس کب تک آنے کا ارادہ ہے؟"،ارتضی نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔ٹھنڈی برستی بارش تلے وہ دونوں روڈ پہ اپنی منزل کی جانب رواں تھے۔

"وقت تو لگے گا۔۔۔"، سنجیدہ لہجے میں کہہ کر وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا تھا۔سماعتوں میں برستی بارش کی تیز آواز گونج رہی تھی۔

"میں تو کہتا ہوں کہ جانے سے پہلے کوئی منگنی، بات پکی وغیرہ کرواتا جا۔کم از کم وہ تیرے نام کی تو ہو جائے۔"،اب کے بہت ہی سمجھداری سے روحان نے بہت ہی کام کی بات کی تو ارتضی دھیرے سے مسکرا دیا۔

"امّاں گئی ہیں آج اس کے گھر پر۔"،اس نے موڑ مڑتے ہوئے اسی سنجیدگی سے کہا تو روحان تو بائیک پر ہی اچھل گیا۔ایک زوردار سا تھپڑ اس کے شانے پہ مارا تھا۔

"ابے۔۔۔تو مرے گا کسی دن میرے ہاتھوں۔"،اس نے بہت ہی غصّے سے کہا تو ارتضی سر جھٹک کر ہنس دیا۔

"کمینے۔۔۔پہلے نہیں بتا سکتا تھا۔۔۔اب بتا رہا ہے۔۔۔لعنتی،دھوکے باز انسان!"،وہ بہت زیادہ غصّہ تھا۔دل چاہ رہا تھا کہ اس رضا کی گچّی ہی مروڑ ڈالے۔ارتضی مسکرا کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ گھر پہنچا تو شام کا اندھیرا کافی حد تک پھیل چکا تھا۔دن کی روشنی رات کی سیاہی میں تبدیل ہونے لگی تھی۔تھکاوٹ کے مارے اس کا سر اور پورا جسم درد کرنے لگا تھا۔وہ پاسپورٹ ڈائننگ ٹیبل پر رکھتا،قدم قدم چلتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔کمرے میں داخل ہوا تو اس کے پلنگ پہ زرینہ بی سر جھکائے بیٹھی تھیں۔وہ انہیں دیکھ کر ٹھہر سا گیا تھا۔

اس کے قدموں کی آہٹ پہ انہوں نے سر اٹھایا تھا اور اگلے ہی پل وہ اٹھ کر دوڑتی ہوئی تیزی سے اس تک آئی تھیں۔ان کے چہرے پہ پریشانی کے ساتھ ساتھ افسردگی بھی چھائی تھی۔ارتضی کو کچھ غلط ہونے کا احساس شدّت سے ہوا تھا۔

"رضا!"،انہوں نے افسوس اور دکھ سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تو وہ نرمی سے ان کا ہاتھ دباتا انہیں لیتا پلنگ تک آیا۔انہیں بٹھا کر خود بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور پوری طرح سے ان کی جانب متوجہ ہوا۔اندر ایک طوفان سا مچا ہوا تھا اور باہر۔۔۔باہر اس سے زیادہ پر سکون انسان تو شاید ہی دنیا میں کوئی ہو۔

"کیا ہوا،امّاں؟"،نرمی سے پوچھا گیا۔زرینہ کی آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔انہوں نے اس کے ہاتھ پہ اپنی گرفت مضبوط کی تھی۔ارتضی کے دل نے ایک دھڑکن مس کی تھی۔

"انہوں نے منع کر دیا ہے،رضا۔"،بہت ہی ہمّت کر کے انہوں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ ڈالا تھا۔ان کی بات پہ انہیں واضح طور پر اس کی آنکھوں میں کچھ ٹوٹتا نظر آیا تھا۔۔شاید وہ آس تھی،یا امید!ان کا ہاتھ تھاما اس کا مضبوط ہاتھ کمزور پڑا تھا۔دل میں مچا شور

جیسے سناٹے میں بدل گیا تھا۔وہ ساکت ساوہیں بیٹھارہ گیا تھا۔

"میں نے ان سے بہت ریکوئیسٹ کی،رضا۔۔۔مجھے معاف کردے،میرے بیٹے۔میں اگر پہلے ہی وہاں رشتہ لے جاتی تو یہ نہ ہوتا۔۔۔مجھے تجھے پہلے منع کرنا ہی نہیں چاہئے تھا۔۔۔مجھے معاف کردے۔"،وہ اس کے چہرے پر کپکپاتے ہوئے ہاتھ پھیرتیں،بہت زیادہ شرمندہ لگ رہی تھیں۔لہجہ میں ندامت اور پچھتاوا تھا۔ارتضی مراد بے دم سا ہوا بیٹھارہ گیا تھا۔کیا کہتا وہ؟کیا کرتا وہ؟کہنے اور کرنے کو کچھ باقی رہا ہی نہیں تھا!

"اگر میں اس دن تیرے بتانے پر ہی رشتہ لے جاتی تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔میں تیرے ارمانوں اور تیری محبت کی قاتل ہوں،رضا۔مجھے معاف کردے۔"،وہ بولی تھیں۔ارتضی نے انہیں کچھ بھی نہیں کہا تھا۔بس بہت ہی نرمی سے اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے نکالا تھا اور اٹھ کر دھیرے سے قدم اٹھاتا وہاں سے جاتا چلا گیا تھا۔

زرینہ نے آنسو بہاتے ہوئے بہت اذیت سے اسے وہاں سے جاتا دیکھا تھا۔وہ احساس

ندامت میں گھری رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

سیاہ رات میں ٹکیا کی مانند چمکتا چاند بہت ہی افسردگی سے نگاہیں جھکائے اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔وہ جو اپنے گھر کی چھت پہ ویران سی بیٹھی تھی۔کپڑے تبدیل بھی نہیں کیے تھے۔انہی دن والے کپڑوں میں ملبوس وہ سیاہ بے رونق آنکھوں سے کسی غیر مرئی نقطے کو تک رہی تھی۔

ٹھنڈی پرزور،تازگی بخش ہواؤں نے چل کر موسم کو اچھا کر رکھا تھا۔ہر سو ایک تازگی سی تھی جو ہر نفس کی روح میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔سوائے اس کے۔۔۔ہاں اسی کے جو انہی ویران آنکھوں سے کسی نقطے کو تکتی عصر حال کے ساتھ ساتھ اپنے حال سے بھی بیگانہ لگتی تھی۔

جبھی پچھلی جانب والی منڈیر کی بالائی سے کسی ہیولے کا سا گمان ہوا تھا۔۔۔جیسے وہاں کوئی کھلے دروازے سے چھت پر داخل ہوا ہو۔ایمان کی نگاہیں بے ساختہ ہی اس جانب اٹھی تھیں

جہاں سے وہ قدم اٹھاتا، اسی جانب چلا آ رہا تھا۔ سیاہ بے داغ شلوار قمیض پہنے، دونوں بازو اور ہاتھ پشت پہ باندھے، وہ نہایت سختی بھری سنجیدگی سے اسے نگاہوں کے حصار میں لیے اس تک آیا تھا۔

ایمان وہیں ہنوز بیٹھے بیٹھے اسے تکے گئی تھی۔ اٹھنے کی نہ تو ہمّت کی تھی، اور نہ ہمّت ہوئی تھی۔ وہ بس ویران سی بیٹھی اسے تکے گئی تھی۔ آنکھوں میں نجانے کہاں سے بہت سی نمی امڈ امڈ آئی تھی۔ بصارت دھندلانے لگی تو اس نے ٹانگوں کے گرد بندھے بازو ہٹا کر ہاتھ کی پشت سے آنکھیں بے دردی سے رگڑ ڈالیں۔

پھر چہرے پر آتے الجھے بکھرے سے سیاہ بالوں کو ہتھیلی سے پیچھے دھکیلا۔ نگاہوں کا مرکز اب بھی وہی تھا۔۔۔ہاں، وہی! وہی جو ویسی ہی ویرانی نظروں میں سموئے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔۔۔یوں جیسے وہ اسے آخری بار دیکھ رہا ہو۔۔۔یوں جیسے آج رات وہ اسے پوری طرح سے دیکھ لینا چاہتا ہو۔۔۔یوں جیسے جدائی کے پہروں کی ابتداء ہو چکی ہو۔۔۔شاید واقعی! جدائی کے پہروں کی ابتداء ہو چکی تھی!

ہر جانب چھائی گہری خاموشی میں اب کے ایک ہلکی سی سرگوشی گونجی تھی جو ایمان کی سماعت تک بھی بخوبی پہنچی تھی۔

"ایمان۔"

وہ اذیت اور شکست خوردگی آنکھوں میں لیے اسے تکتا کہہ رہا تھا۔ایمان بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ دیکھے، بغیر کچھ سنے، بس ہولے سے چارپائی پہ ہتھیلیاں جما کر اٹھی تھی اور ایک گہرا نم سانس خارج کر کے آنکھوں میں ابل ابل کر آتی نمی کو پیچھے دھکیلتی، قدم قدم چلتی ہوئی وہیں پچھلی منڈیر تک آگئی تھی۔

اب کے وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے، اپنے سامنے کھڑی منڈیروں پہ ہتھیلیاں جمائے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔چاند ان پہ اپنی چاندنی نچھاور کرتا ان کو اسی افسوس سے تک رہا تھا۔تاروں نے بھی ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشی کر کے باقی رہتے تاروں کو ان دونوں کی جانب متوجہ کیا تھا۔

چاند کی چاندنی میں ان دونوں کے چہرے بالکل شفاف و پاک لگتے تھے۔ جہاں ایمان زاویار کے چہرے پر ایک ناامیدی اور بے بسی تھی، وہیں اگلی جانب ارتضی مراد کے چہرے پر کوئی الگ، کوئی عجیب سا تاثر تھا۔ وہ اس تاثر کو کوئی نام نہ دے سکی تھی۔ رات کی نیلی تاریکی، اور اس پر چاند کی سفید چاندنی نے جیسے ہر وجود کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔

جبھی چاند کی چاندنی میں نہائے دو مجسموں میں سے ایک نے پھر سے سرگوشی کی تھی۔

"خدا حافظ۔"، نم نینوں والی لڑکی کی باریک سی، لرزتی آواز سماعتوں سے ٹکرا کر اس سحر میں ایک ارتعاش سا پیدا کر رہی تھی۔ "آج تمہیں میں خدا حافظ کہنے آئی ہوں۔"

وہ سر جھکائے ہوئے تھی۔۔۔ اور وہ اسے تکتا جا رہا تھا۔۔۔ سنتا جا رہا تھا۔۔ دم سادھے!

"تم برے نہیں تھے۔۔۔ مگر بری میں بھی نہیں تھی۔ بری تو یہ قسمت تھی، رضا۔ تم نے اپنی محبت کو ثابت کر دیا۔ اپنی امی کو بھیج کر اپنی سچائی کا یقین بھی دلا دیا۔۔۔ مگر، اب میں نہیں جانتی کہ کیسے تمہیں اپنی محبت کا یقین دلاؤں۔ الفاظ ختم ہو گئے ہیں۔ لمحات بیت چکے

ہیں۔۔۔اور اب جو رہ گیا ہے، وہ صرف ایک تا عمر ساتھ رہنے والا دکھ اور درد ہے۔"، وہ متورم لہجے میں کہتی جا رہی تھی اور وہ افسردگی سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔اس کی شہد آنکھوں میں نمی کے پہاڑ تھے۔

"مجھے بد دعا نہ دینا، رضا۔ میں بری نہیں تھی۔نہ میں ڈرپوک تھی۔ میں بس بد قسمت تھی۔"، وہ اب کے سر جھکائے، آنسو اندر ہی اندر گراتی، بہت اذیت سے کہہ رہی تھی۔آنکھوں کو ایک بار پھر مسل ڈالا تھا۔بے حسی سے رگڑ ڈالا تھا۔

"نہیں ایمان۔۔۔تم بد قسمت نہیں ہو۔ میں تمہیں بد دعا تو کبھی دے ہی نہیں سکتا۔تم بری نہیں ہو۔نہ ہی کبھی تھی۔نہ تم ڈرپوک تھی اور نہ ڈرپوک ہو۔اور ایسے ہی، نہ تم بد قسمت تھی نہ تم بد قسمت ہو۔بس وقت برا ہے۔وقت برا ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ قسمت بری ہے۔ برے وقت تو آتے رہتے ہیں۔ان سے پست ہمّت ہو کر ہار نہیں ماننی چاہیئے۔"، وہ اب کے بولا تو اس کی آواز ویسی ہی گھمبیر اور ویسی ہی سنجیدہ تھی۔وہی توازن تھا۔وہی سختی تھی۔جو ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔

اس کے لہجہ میں جہاں ایک افسردگی تھی، وہیں ایک مضبوطی بھی تھی۔ایک ضبط بھی تھا۔ایک ہمّت بھی تھی۔کیا وہ اس کی طرح مایوس نہیں تھا؟ کیا وہ اس کی طرح ناامید نہیں تھا؟ کیا وہ اس کی طرح بکھرا ہوا نہیں تھا؟ نہیں تھا تو کیسے نہیں تھا؟

"اللہ آزمائشیں دیتا ہے۔تکلیفیں نہیں۔تکلیفیں تو یہ دنیا والے دیتے ہیں۔جن کا آخر میں کوئی صلہ، کوئی اجر نہیں ملتا۔مگر اللہ کی دی گئی آزمائشوں کے بعد دل کو پر سکون اور خوش کر دینا والا صلہ اور اجر ملتا ہے۔ناامیدی اور مایوسی کفر ہے۔اور ہم کافر تو نہیں ہیں نا؟"،اس نے بہت ہی سنجیدگی اور سمجھداری سے کہتے ہوئے اسے ہلکے سے مسکرا کر دیکھا تھا۔آنکھیں اس کی بھی نم ہی تھیں۔ارتضی مراد ایمان زاویار کو ڈیل کرنا اچھے سے جانتا تھا۔

"کسی سیانے کا کہنا ہے کہ جب اللہ ساتھ ہو تو مخالف کوئی بھی ہو، فرق نہیں پڑتا۔"،اس نے اب کے ایمان کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ جو سر جھکائے کھڑی تھی، یکدم ہی خالی خالی نظریں اٹھائے اسے دیکھنے لگی تھی۔جیسے اس کی بات کی سمجھ نہ آئی ہو۔

"میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"، اچانک ہی ارتضی نے سر ہولے سے جھکا کر اسے دیکھ کر پوچھا تو وہ نجانے کیوں، سر اثبات میں ہلانے لگی۔ مگر سمجھ تو وہ شاید نہیں رہی تھی۔

"میں کل شام میں لندن جا رہا ہوں۔"

اچانک ہی ارتضی نے کہا تو وہ جو کسی اور ہی رو میں تھی، یکدم ہی بری طرح ٹھٹھک کر رکی۔ آنکھوں کی نمی پانی بن کر لڑیوں کی صورت گالوں پہ تواتر کے ساتھ لڑھکنے لگی تھی۔ اتنی دیر سے روکے ہوئے آنسو کسی آبشار کی مانند بہنے لگے تھے۔ ارتضی کے دل کے کسی چھپے گوشے میں بے ساختہ ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔ اسے روتے ہوئے دیکھنا تکلیف دیتا تھا۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟ میں دلوں میں فاصلے تھوڑی پیدا کر رہا ہوں۔ یہ فاصلے وقتی ہیں، دائمی نہیں۔ میرا جانا ضروری ہے، بہت ضروری۔"، وہ اسے نرمی سے دیکھتے ہوئے بولا تو وہ روتے ہوئے ہی نفی میں سر ہلانے لگی۔ پھر ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑ ڈالیں اور اسے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔

"تم کبھی میرے کچھ بن ہی نہیں سکے، رضا۔ میں تمہارے نام کبھی ہو ہی نہیں سکی۔ اور اب کسی اور کے نام ہونے جا رہی ہوں۔ مگر دل کا رشتہ شاید ہی کبھی ٹوٹ سکے۔ افسوس کہ میں تو عامر کے ساتھ بھی منافقت والی زندگی گزارنے والی ہوں۔"، اب کے وہ شرمندگی سے سر جھکا گئی تھی۔ شرم کا ہی تو مقام تھا یہ اس کے لیے۔ اس کی بات سن کر ارتضی کو ایک اور ٹیس دل میں اٹھتی محسوس ہوئی تھی، مگر بظاہر خود پر جبر کیے، ویسے ہی کھڑا رہا۔

بیچارہ! تاروں نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"اللہ سب بہتر کرے گا۔ انشاءاللہ۔ خدا حافظ۔"، نرمی سے کہتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرا کر پلٹ گیا تھا۔ ایمان یونہی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح، خالی ہاتھ۔

☆☆☆

کراچی میں فجر کی اذانیں ہر سو گونجنے لگیں تو فضا نے بھی شب کو خیر باد کہا اور صبح کی خوش آمدی کی تیاری کرنے لگی۔ پرندے آشیانوں سے نکل کر رزق کھوجنے میں جت گئے تھے۔ ہلکی

نیلی جامنی سی روشنی ہر سو چھانے لگی تھی۔

ایسے میں کراچی کے ایک پوش علاقے میں بھی فجر اترتی،اس کے مکینوں کو جگا گئی تھی۔

بالکونی کا گلاس سلائیڈنگ ڈور کھولا گیا تھا اور دو دودھیالے پیروں نے بالکونی کے سنگ مرمر کے فرش پر قدم دھرے تھے۔سفید بے داغ شلوار قمیض کے ساتھ سفید ہی دوپٹہ سر کے گرد نماز کے سے انداز میں باندھے وہ بالکونی میں داخل ہوئی تھی۔

قدم قدم چلتی وہ بالکونی کی گیلری تک آئی تھی اور پھر رخ سلائیڈنگ ڈور کی بانب کر کے ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔جامنی وسیع سے آسمان میں کہیں کہیں نارنجی کاٹن کینڈی جیسے بادل بکھرے تھے۔ایک سحر سا تھا جو انسان کو مسحور کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ایک تازگی سی تھی جو روح میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

ہلکی ہلکی روشنی ہر سو بکھری تھی اور ٹھنڈی تازگی بخش ہواؤں نے چل کر سحر کو مزید خوبصورتی بخش دی تھی۔پرندوں کی مدھم چہچہاہٹ کا نغمہ کان میں اتر تا روح افزا معلوم ہوتا

تھا۔ہوائیں چل کر اس کے سفید دوپٹے کو پھڑ پھڑانے پر مجبور کر رہی تھیں۔

جبھی کھلے ہوئے سلائیڈ نگ ڈور سے دو قدم اندر آئے تھے۔ہلکی پھلکی سی سرمئی ٹی شرٹ کے ساتھ ہم رنگ ٹراؤزر پہنے،وہ سنہری بال ماتھے پر بکھیرے مسکراتا ہوا اسے دیکھتا باہر آیا تھا۔

سنہری سپید سی رنگت دمک رہی تھی۔سنہری آنکھوں میں محبت اور زندگی سے بھرپور چمک رقصاں تھی۔سپید چہرے پر ہلکی ہلکی شیو تھی۔وہ مسکراتا ہوا غزل تک آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا تھا۔غزل نے مسکرا کر چہرہ موڑ کر اسے دیکھتا تھا۔جواباً وہ یونہی مسکراتا رہا۔

"ہوں؟تو ہو گئی آپ کی خواہش پوری؟"،اس نے مسکرا کر پوچھا تو غزل نے خوشی اور ایکسائٹمنٹ کے ملے جلے تاثرات لیے سر اثبات میں ہلایا۔خوشی اس کے چہرے پر صاف درج تھی۔رمیص مسکرایا تھا۔وہ زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔

www.novelsclubb.com

"تھینک یور میص فار ایوری تھنگ۔"، مسکرا کر غزل نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کر سر نفی میں ہلانے لگا۔

"او نہوں۔۔۔ تھینک یو کے لیے نہیں کیا میں نے یہ۔۔۔ تمہاری خواہش تھی۔اور تمہاری خواہش پوری کرنا میرا فرض۔ میں نے تو محض اپنا فرض نبھایا ہے۔"، شانے ہلکے سے اچکا کر اس نے کہا تو اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

"ویسے۔۔۔"، ویسے پر اچھا خاصا زور دے کر اس نے ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر غزل کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔"یہ ہی خواہش تھی نا آپ کی کہ آپ کا اپنا ایک گھر ہو۔۔۔ جس میں آپ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہیں۔ چھوٹا سا، پیارا سا گھر۔۔۔ بالکل کسی فیری ٹیل کی طرح۔۔۔"

ابھی وہ مزید کہہ ہی رہا تھا کہ غزل نے سر یکدم ہی نفی میں ہلایا تو وہ ٹھہر سا گیا۔ پھر سوالیہ نگاہوں سے اسے تکنے لگا۔

"پیارا سا گھر تو چاہیئے تھا۔۔۔ مگر کسی فیری ٹیل جیسا نہیں۔۔۔ اکثر فیری ٹیلز کی اینڈ نگز اچھی نہیں ہوتی۔۔۔ مگر مجھے اپنی کہانی کی اینڈ نگ اچھی چاہیئے۔۔۔"، غزل نے اپنے ازلی نرم لہجے میں کہتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تو رمیص ہلکا سا مسکرایا۔

"ہاں تو بیگم صاحبہ۔۔۔ ہماری اینڈ نگ تو اچھی ہی ہے۔۔۔ ہم دونوں ساتھ ہیں۔ ہمارا بیٹا ہمارے ساتھ ہے۔۔۔ اچھی اینڈ نگ تو ہے ہماری۔"، رمیص نے خوب مسکرا کر کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔۔۔ ہاں وہ جانتی تھی کہ اس کی زندگی اتنی خوبصورت ہی ہے۔

"ویسے ایک بات ہے۔۔۔"، جبھی رمیص نے ایک بار پھر اسے دیکھ کر کہا تو وہ اس کے بولنے کی منتظر اسے دیکھنے لگی۔

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں تو اتنا ہینڈسم ہوں۔۔۔ یو نو۔۔۔ حسین۔۔۔ مگر تم۔۔۔"، اس نے ایک تفصیلی نگاہ غزل پر اوپر سے نیچے تک ڈالی اور بمشکل مسکراہٹ روکی۔ غزل کی بھنویں بھینچی تھیں۔ لب سختی سے ایک دوسرے سے پیوست ہوئے تھے۔ وہ جان گئی تھی کہ

اب وہ کیا بکواس کرنے والا ہے۔"سوری ٹو سے۔۔۔مگر تم اتنی خاص نہیں۔۔۔"

ابھی وہ مزید کچھ بول ہی رہا تھا کہ غزل نے اپنا پیر بہت زور سے اس کے پیر پر مارا تھا۔وہ بلبلایا تھا اور پھر اسے دیکھا تھا جو خونخوار نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔اس کی سفید رنگت سرخ پڑ رہی تھی۔

"دفع ہو جاؤ۔۔۔"،وہ غصّے سے کہتی دھپ دھپ کرتی اندر چلی گئی تھی۔پیچھے وہ بھی ایک زوردار قہقہہ لگاتا اس کے پیچھے ہی اندر بھاگا تھا۔

"اچھا سنو تو۔۔۔سوری نا۔"،وہ کان پکڑے اس کے پیچھے پیچھے چلتا جا رہا تھا اور غزل انگلی ناں میں ہلاتی نفی کرتی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

اس کی ہیزل آنکھوں میں ڈھیروں نمی در آئی تھی۔آنکھیں سرخ پڑ کر اب دہکتی محسوس ہو رہی تھیں۔کیا خوشیوں کی مدّت اتنی ہی ہوتی ہے؟کیا اس کی زندگی کی کہانی بھی محض ایک فیری ٹیل تھی جس کا اختتام روح کو زخمی کر دینے کی حد تک اذیت ناک اور دردناک تھا؟

ایک احساس تکلیف کا اس کی روح کو اپنے شکنجے میں لے رہا تھا۔وہ سامنے سلائیڈ نگ ڈور کے اس پار گھر میں آج بھی رمیص کو دیکھا کرتی تھی۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کہیں دور نہیں گیا۔اس کے دل میں آج بھی ویسے کے ویسے رہ رہا ہے۔

کچھ یادیں بہت تکلیف دہ ہوا کرتی ہیں۔۔۔اور کچھ تو روح کو گھائل کر دینے کی حد تک سفاک ہوتی ہیں۔رمیص جہانزیب کی یادیں بھی ایسی ہی تھیں۔دل کو خون کے آنسو رلانے والی۔

☆☆☆

حیدر آباد میں شام اتر چکی تھی۔مراد منزل میں خوب چہل پہل لگی ہوئی تھی۔ارتضی کی آٹھ بجے کی فلائٹ تھی۔ابھی اس وقت وہ بالکل تیار سا کھڑا تھا۔سیاہ ٹی شرٹ کے ساتھ نیلی جینز پہنے، شہد رنگ بالوں کو سلیقے سے سیٹ کیے، سنجیدہ چہرہ لیے وہ اپنے گھر کی چوکھٹ پر کھڑا تھا۔

ایک ہاتھ سے اپنا سوٹ کیس تھام رکھا تھا جبکہ کاندھوں پر ایک سیاہ بستہ لٹکا رکھا تھا۔پر کشش سے چہرے پر نجانے کیوں ایک سختی سی چھائی تھی۔

گھر میں افر تفری مچی تھی۔زرینہ بیگم تیزی سے چلتی ہوئی اس تک آئی تھیں۔اس کے سامنے کھڑے ہو کر انہوں نے اس کے چہرے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کی تھیں اور پھر لب ہلاتی کچھ پڑھنے لگی تھیں۔ارتضی کے چہرے کی سختی میں انہیں دیکھ کر نرمی سی گھلی تھی۔وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔

کچھ دیر تک بے آواز پڑھتے رہنے کے بعد زرینہ نے چہرہ اوپر کو اٹھا کر اس پر پھونک مار کر دم کیا تھا۔پھر اپنے دونوں ہاتھوں پر بھی پھونک مار کر انہوں نے اس کے چوڑے شانوں، بازوؤں اور چہرے پر پھیرا تھا اور پھر اسے دیکھ کر نرمی سے ہولے سے مسکرائی تھیں۔

"رضا۔۔۔ایک بار پھر۔۔۔مجھے معاف کر دینا بیٹا۔۔۔میں ایسا بالکل نہیں چاہتی تھی جیسا ہو گیا ہے۔"،وہ کچھ شرمندگی سے کہہ رہی تھیں۔ارتضی نے ایک گہرا سانس لے کر سر نفی میں ہلایا تھا اور پھر سوٹ کیس کا ہینڈل چھوڑ کر ان کے قریب ہوا اور ان کے دونوں نحیف ہاتھ اپنے

مضبوط ہاتھوں میں تھام کر چہرہ جھکا کر انہیں دیکھا۔

"ماں باپ اپنے بچوں سے معافی مانگتے ہوئے بالکل اچھے نہیں لگتے، ماں جی۔ آپ میری جان ہیں۔ میرا مان اور میرا فخر ہیں۔ آپ اداس مت ہوں۔ اللہ کے خزانوں میں میرے لیے بہت کچھ ہے۔"، اس نے نرمی سے انہیں دیکھ کر کہا تو وہ نم آنکھوں سے مسکرا دیں، پھر آگے بڑھ کر انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ارتضی مسکرایا تھا۔

"بس ایک وعدہ کریں مجھ سے، ماں جی۔"، یکدم ہی ارتضی نے اسی نرمی سے کہا تو وہ اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

"ایمان کو زندگی میں کبھی بھی اگر آپ کی ضرورت پڑی۔۔۔ یا کسی سہارے کی ضرورت پڑی، آپ اسے اکیلا نہیں چھوڑیں گی۔ وعدہ کریں مجھ سے۔"، اس نے بہت ہی منّت بھرے لہجے میں آنکھوں میں نمی لیے کہا تو وہ ہلکا سا مسکرائیں۔

"یہ بھی کوئی کہنے والی بات ہے بھلا؟ وہ تو میری بیٹیوں جیسی ہے۔ میرے ہاتھوں میں

کھیلی ہے۔۔۔اس کا خیال میں کیوں نہیں رکھوں گی؟"،وہ بڑے مان سے کہہ رہی تھیں۔

ارتضی ایک بار پھر مسکرایا تھا۔ایک یہی تو تسلی چاہیئے تھی اسے۔

پھر وہ سب کو خدا حافظ کہتا،ایک آخری بار ماں جی کو گلے لگا کر باہر چلا گیا تھا۔مراد صاحب،شان اور اس کے کچھ کزنز کے علاوہ روحان بھی اس کے ساتھ ہی گیا تھا۔وہ سب گاڑی میں بیٹھ گئے تو مراد صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کی۔وہ پیسنجر سیٹ پر بیٹھا یکدم ہی سر اٹھا کر اوپر دیکھنے لگا تھا۔

اوپر ایک گھر کی چھت کی پچھلی منڈیر پر ہاتھ رکھے،کوئی سیاہ آنکھوں والی لڑکی اسے دیکھ رہی تھی۔سیاہ آنکھوں کے پپوٹے پانی سے بھرے ہوئے تھے۔اس نے لب بھینچ کر خود کو رونے سے روک رکھا تھا۔دل کی حالت غیر ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔اذیت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی محسوس ہو رہی تھی۔چہرہ ضبط سے سرخ پڑ رہا تھا۔

ارتضی مراد ایمان زاویار کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا تھا۔اس کی آنکھوں میں ایک جذبہ سا

چمک رہا تھا۔۔۔کچھ ایسا تھا اس کی شہد آنکھوں میں جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ایمان کو لگا تھا جیسے وہ اسے کوئی تسلی دے رہا ہو۔مگر تسلی؟وہ بھی اس وقت؟اگلے ہی لمحہ گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی تھی۔

ایمان کی آنکھوں نے گاڑی کے غائب ہو جانے تک اس شخص کا پیچھا کیا تھا۔جب وہ چلا گیا تو اس نے ایک گہرا نم سانس خارج کر کے آنکھیں موندیں۔آنسو لڑیوں کی سی صورت اس کی پلکوں کی باڑ کو توڑتے گالوں پر گرتے چلے گئے تھے۔

کیا آنے والوں کا جانا ضروری ہوتا ہے؟

کیا ایمان کی زندگی میں رضا محض اتنی مدّت کے لیے ہی آیا تھا؟

کیوں ضروری ہوتی ہے محبت میں جدائی؟

کیوں کوئی محبت اختتام میں ساتھ نہیں رہتی؟

کیوں؟آخر کیوں؟

www.novelsclubb.com

وہ پیچھے ہٹتی چلی گئی تھی۔ وہ چلا گیا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں شاید جانے کے لیے ہی آیا تھا۔

اور جو چلے جائیں، ان کا انتظار کرنا یقینی ہوتا ہے۔

مگر ایمان کو اس کا انتظار نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ارتضی مراد اس کی زندگی میں پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ وہ جتنی مدّت کے لیے آیا تھا، وہ مدّت پوری ہو چکی۔

آج ارتضی مراد ایمان زاویار کی زندگی سے چلا گیا تھا!

☆☆☆

حیدر آباد ایئر پورٹ کی ٹرمنل بلڈنگ اس وقت مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔

لوگ اپنا اپنا لگیج اٹھائے اپنی اپنی فلائٹ کے منتظر آنا جانا کر رہے تھے۔۔۔ جبھی ٹرمنل بلڈنگ کے داخلی حصّے میں اس وقت دو لوگ کھڑے نظر آتے تھے۔

ایک ارتضی مراد تھا جبکہ دوسرا روحان یامین۔ وہ دونوں سیدھ میں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر سنجیدگی رقم تھی۔ روحان منتظر سا

لگتا تھا جبکہ ارتضی کچھ کنفیوژڈ۔

"کیا ہوا ہے رضا۔۔۔؟ بول بھی دے۔"، روحان نے اسے دیکھتے ہوئے کچھ سنجیدگی سے استفسار کیا تو ارتضی نے ایک طویل سانس خارج کر کے اسے کچھ پریشانی اور تفکر سے دیکھا۔

"ایک وعدہ کرے گا مجھ سے تو؟"

روحان نے سرعت سے سر اثبات میں ہلاتے اسے تسلی تھمائی تھی۔ارتضی کے گلے میں گلٹی ڈوب کر ابھری تھی۔

"میری ایمان کا خیال رکھنا، روحان۔۔۔اس کو جب تمہاری مدد کی ضرورت پڑے، اس کی مدد کرنا۔اس کو اکیلا ہرگز نہ چھوڑنا۔"، وہ کہتا جا رہا تھا اور روحان عجیب حیرانی اور نا سمجھی لیے اس کی تمام باتیں سن رہا تھا۔وہ آج اس کی زندگی سے جاتے ہوئے بھی اسی کی فکر میں گھلے جا رہا تھا۔روحان کو بے اختیار اس پر ڈھیر سارا ترس آیا تھا۔

"اس کو چھوڑ دے، رضا۔اس کو اپنی یادوں کے جال میں پھنسنے نہ دے۔وہ نئی زندگی کی

شروعات کر رہی ہے۔اس کو کرنے دے۔"،اس نے نجانے کیوں ارتضی کو سمجھانا چاہا تھا۔ ارتضی نے اس کی بات پر بے ساختہ ہی سر نفی میں ہلایا تھا۔۔۔

اور۔۔۔

اور اس کے بعد ارتضی مراد نے روحان یامین سے جو الفاظ، جو جملے کہے تھے، وہ ایک بڑے عرصے کے لیے روحان یامین کو باندھ کر رکھنے والے تھے۔وہ وعدہ بہت بڑا، بہت مشکل ثابت ہونے والا تھا جو جاتے سمے، اس کا ہاتھ تھام کر ارتضی مراد نے لیا تھا۔ارتضی کے لہجے اور آنکھوں میں جھلکتی واضح منّت تھی جو روحان کو وعدہ پورا کرنے کے لیے ہامی بھرنے پر اکسا گئی تھی۔

"تم فکر نہ کرو۔۔۔اب ایک وعدہ میں بھی تم سے کرتا ہوں آج۔"،ارتضی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔"تم مجھے، روحان یامین کو ہر پل اپنے ساتھ پاؤ گے۔ساری دنیا بھی تمہیں چھوڑ جائے، روحان تمہیں نہیں چھوڑے گا،

www.novelsclubb.com

رضا۔۔۔"

ارتضی نے طمانیت بھری سانس خارج کر کے مسکراتی نم آنکھوں سے روحان کو دیکھ کر سر اثبات میں ہلایا تھا، پھر اس سے ایک آخری بار گلے مل کر وہ مڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ پیچھے باقی سب بھی اسے الوداع کہتے، نم آنکھیں رگڑتے، واپسی کے لیے مڑ گئے تھے۔

روحان کی آنکھوں نے اس کا آخر تک پیچھا کیا تھا۔ وہ آخر میں نم آنکھوں سے دھیرے سے مسکرا کر پلٹ گیا تھا۔

زندگی مشکل تھی۔۔۔ مگر ہماری کہانی کے کردار یہ بات نہیں جانتے تھے کہ اب زندگی کا جو چہرہ ان کے سامنے آنے والا ہے، وہ مشکل نہیں ہو گا۔ وہ اذیت ناک ہو گا۔ وہ خطرناک ہو گا۔

زندگی کی راہ گزر کے راہی اپنے اپنے راستوں کو منتخب کرتے آگے بڑھ چکے تھے۔۔۔ منزل کیا تھی، خدا جانے!

جاری ہے!

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول،افسانہ،شاعری،ناولٹ،کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک،انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP: